گولڈن جوبلی ایڈیشن
جھوٹے روپ کے درشن
پنجاب یونیورسٹی کی مہکتی فضاؤں میں پروان چڑھنے والی محبت کی داستان
راجہ انور

فہرست

جھوٹے رُوپ کے درشن

احمد ندیم قاسمی

پاکستان نیشنل سینٹر میں ایک معروف طالب علم رہنما راجہ انور کی ایک تازہ تصنیف ''جھوٹے رُوپ کے درشن'' کی افتتاحی تقریب منعقد ہوئی۔ صدارت صوبائی وزیر ملک مختار اعوان نے کی۔ راجہ انور کے مختلف احباب نے اُن کی شخصیت کے بارے میں بہت دلچسپ اور شگفتہ تقریریں کیں۔ میں نے اس کتاب کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی۔ جو کچھ میں نے عرض کیا اس کا خلاصہ یہ ہے۔

راجہ انور کے بارے میں مجھے صرف اتنا علم تھا کہ وہ طالب علموں کا ایک باشعور رہنما ہے اور آتش بیان مقرر ہے۔ پھر کچھ عرصے کے بعد میں نے اُس کی کتاب ''بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک'' پڑھی تو مجھے معلوم ہوا کہ اُسے تحریری اظہار پر بھی قدرت حاصل ہے جس سے بیشتر ارباب سیاست محروم ہوتے ہیں۔ اب اُس کی دوسری اور تازہ تصنیف ''جھوٹے رُوپ کے درشن'' میرے سامنے ہے۔ اس کتاب کا مجموعی تاثر المیے کا ہے مگر میں اُس کی کرب انگیزی کا شکار ہونے کے باوجود خوش بھی ہوں اور میری اس خوشی کا ایک ٹھوس سبب ہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کے ابتدائی دنوں میں روایتی شعروادب کو رد کر دینے کے شوق میں نقادوں اور رہنماؤں کے ایک طبقے کی طرف سے معاملاتِ حسن وعشق کے اظہار کی مذمت کی گئی تھی اور یہ دلیل پیش کی گئی تھی کہ یہ صرف دولت اور وقت کی فراوانی کی کرشمہ سازی ہے اور اِس عہد میں جب انسان کے لیے اپنے آپ کو عزت سے زندہ رکھنا ہی ایک مسئلہ ہے، حسن سے متاثر ہونا اور عشق میں مصروف رہنا رجعت پسندی اور زوال آمادگی ہے۔ شکر ہے کہ ترقی پسندی کا یہ معیار جلد باطل ثابت ہو گیا اور ثقہ

بند ترقی پسندوں نے محبت کو انسانی شخصیت کی تکمیل کا لازمہ قرار دیا۔ ترقی پسندانہ نظریۂ حیات میں یہ اصلاح بحیثیت ادیب تو میرے لیے نہایت خوش آئند تھی مگر مجھے شبہ ہوتا تھا کہ ہمارے بعض انقلابی رہنما محبت کے جذبے سے محروم ہیں اور اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ انہوں نے کبھی محبت نہیں کی یا انھیں کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ چنانچہ چند برس پہلے جیل میں، پنجاب کے ایک بزرگ اور محترم انقلابی رہنما سے میں نے عرض کیا کہ آپ نے جب انقلابی سرگرمیوں میں اتنی مصروف زندگی گزاری ہے تو ظاہر ہے کہ آپ کو جوانی میں بھی کسی سے محبت کرنے کا وقت کہاں ملا ہو گا۔ انہوں نے پلٹ کر مجھے اِس طرح دیکھا جیسے میں نے اُن کے ساتھ کوئی بدسلوکی کی ہے۔ پھر اُن کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک آ گئی۔ جو صرف اُس وقت پیدا ہوتی ہے، جب روکے ہوئے آنسو پتلیوں پر پھیل جاتے ہیں۔ تب انھوں نے مجھے اپنی محبت کا ایک دل گداز واقعہ سنایا اور میرے دل میں اس انقلابی رہنما کی عزت اور بڑھ گئی۔ میں نے سوچا کہ یہ شخص نظریاتی مشین نہیں ہے۔ محسوساتی مخلوق ہے۔ میرا یقین ہے کہ جو لوگ انسانوں کے جبلی اور بنیادی جذبات کی قدر کرنا نہیں جانتے، وہ ادھورے لوگ ہوتے ہیں۔ چاہے وہ بہت بڑے مصلح ہوں، چاہے بہت بڑے انقلابی۔

راجہ انور کی تازہ تصنیف پڑھ کر مجھے اِسی لیے خوشی ہوئی ہے نہ جانے مستقبل کے لیے اس نوجوان کے کیا ارادے ہیں۔ لیکن اگر اُس نے سیاسی لیڈر بننا پسند کیا تو یہ ایک ایسا لیڈر ہو گا جسے دیکھ کر نہ ہنسی آئے گی، نہ اُس سے ڈر لگے گا۔ بلکہ اُس پر پیار آئے گا۔ کیونکہ اُس نے پیار کی تمام پرتوں اور مرحلوں کو، اپنے خون میں کھپا کر اپنی شخصیت کا ایک ناگزیر حصہ بنا لیا ہے۔

راجہ انور کی اِس تصنیف کا مرکزی کردار خود راجہ انور ہے۔ یہ راجہ انور اپنی محبوبہ کی طرف سے سپردگی کی معراج سے لذت یاب ہونے کے فوراً بعد رد کر دیا گیا ہے۔ محبت کی تاریخ میں اِس تضاد کا نتیجہ تین صورتوں میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ خودکشی کی صورت میں، دماغی توازن کھو بیٹھنے کی صورت میں، یا بھری کائنات سے کلیۃً مایوس ہو کر پوری زندگی ایک کلبی، ایک cynic کی طرح گزار دینے کی صورت میں۔ راجہ انور کی شخصیت نے ان تینوں صورتوں میں سے کوئی صورت قبول نہیں کی۔ اُس نے ایک چوتھی صورت قبول کی ہے اور یہ نفی کی نہیں اثبات کی صورت ہے۔ یہ

شکستہ ریزوں کو چننے اور جوڑنے کی صورت ہے۔ اور یہ وہ صورت ہے جو ایک ایسا نوجوان قبول کر سکتا ہے جسے انسان کی عظمت اور اُس کی آخری فتح پر یقین کامل ہو۔ مجھے یوں ہی شُبہ سا ہوا کہ کتاب کے آخری باب، یعنی ۱۹ اکتوبر ۱۹۷۳ء کے خط میں راجہ انور اس حد تک تلخ ہو گیا ہے جو اس کی شخصیت کی حد سے کچھ آگے کی حد ہے۔ اس کی شخصیت جو اس کتاب کے بیشتر حصے میں نمایاں ہوتی ہے، اُبھرتی اور محبت کے روایتی معیاروں پر چھا جاتی ہے اس شخصیت میں محبت کے کرب نے گداز اور نرمی اور فراخدلی پیدا کر دی ہے۔ یہ شخصیت اپنے رقیب کو بھی دُکھ پہنچانے کی روادار نہیں رہی۔ مگر اِس آخری باب میں مصنف اپنی بے بس محبوبہ پر ٹوٹ ٹوٹ کر برسا ہے۔ حالانکہ اس بے بسی کے جِواز میں 'کنول' کے خط کی یہ سطور پیش کی جا سکتی ہیں جو اس کتاب کا ایک حصہ ہیں کہ ''محسوس کرتی ہوں جیسے میں کسی غلط جگہ پیدا ہو گئی ہوں۔ اپنے ناموس کی خاطر اپنی اولاد کو ذبح کر دینا یہاں کا دستور ہے۔ میں ایک ناتواں عورت! ان سے کیسے لڑوں گی اور کب تک؟ میں تو یہی سوچ...... سوچ کر پاگل ہو جاتی ہوں۔ میرے پاس دعا اور انتظار کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔''

خود راجہ انور کو بھی شروع سے آخر تک اس سماجی تفاوت کی آگاہی حاصل رہی ہے۔ چنانچہ میں سمجھتا ہوں کہ اِس سارے المیے کا اصلی مجرم وہ غیر ہموار اور غیر فطری معاشرہ ہے جس کے اُصول محبت کرنے والوں کے درمیان ایک دھماکے کی طرح پھٹتے ہیں اور یکایک وہ آہنی فصیل اُبھر آتی ہے جس کے دونوں طرف تنہائیوں کا سناٹا مسلط ہو جاتا ہے۔ راجہ انور کو بھی اِس حقیقت کا علم ہے کہ اُس کی محبت کو طبقاتی امتیاز کی تلوار کی دھار پر رکھ دیا گیا ہے، مگر اُس کی مخاطب 'کنول' ہے۔ اس لیے وہ اسی کو زر پرست طبقے کی علامت قرار دے کر دھن ڈالتا ہے۔ شاید اس لیے کہ میں پُرانی نسل سے تعلق رکھتا ہوں، مجھے راجہ انور کے اس آخری خط کا لہجہ اُس کی پوری تصنیف کے لہجے سے مختلف اور اُکھڑا اُکھڑا محسوس ہوا ہے۔ اس کے بین السطور ''انتقام! انتقام!'' کی گونج سنائی دیتی ہے اور کتاب کا نام بھی اِسی ردِ عمل کی کارروائی معلوم ہوتا ہے، حالانکہ ہم پُرانے لوگ تو اِن حالات میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کر لیا کرتے تھے کہ

ہم نے ہر غم سے نکھاری ہیں تمھاری یادیں
ہم کوئی تم تھے کہ وابستۂ غم ہو جاتے

مگر میں جانتا ہوں کہ راجہ انور کی نوکِ قلم کا حقیقی ہدف وہ معاشی اور معاشرتی نظام ہے جو محبت کی بے ساختگی اور سچائی کا کٹر دشمن ہے۔ اسی لیے تو راجہ انور نے کتاب کا انتساب نئی نسل کے نام کیا ہے جو ہمارے دُکھوں کا حساب چُکائے گی اور کتاب کی آخری سطر بھی یہ ہے کہ ''باقی حساب ہماری نسلیں آپس میں طے کرلیں گی''۔ مگر میرا سوال پھر وہی ہے کہ جب یوم الحساب کا انعقاد نئی نسل کے سپرد کر دیا گیا ہے تو اس 'کنول' پر اتنی شدید طعنہ زنی کیوں، جو اس طبقے سے تعلق رکھتی ہے، جس کا حساب چکنا ابھی باقی ہے۔

مصنف کے اِس طرزِ عمل کا جواز صرف اس حقیقت سے مل سکتا ہے کہ نوجوانی کا عالم ہے اور صدمہ مبالغے کی حد تک شدید ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ یہی شدید محبت کرنے والا نوجوان پوری کتاب میں نہایت متوازن انداز اختیار کیے رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے انسانی مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور انھیں اپنے اِس دور کے تناظر میں سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر اُس کے نظریۂ اخلاق ہی کو لے لیجیے۔ کتاب کے آخر میں جب ایک طوائف اسے اپنا جسم پیش کرتی ہے تو وہ کہتا ہے ''نہیں۔ میں انسان کا گوشت نہیں کھا سکتا!'' ایک اور جگہ وہ اعلان کرتا ہے کہ ''میں محبت سے لے کر نفرت تک، کسی مقام پر بھی کسی کو دھوکا دینا جائز نہیں سمجھتا۔'' وہ منفی قسم کی آزادیاں جو آج کل کے بعض نوجوانوں میں بہت مقبول ہیں...... راجہ انور کے لیے قابلِ قبول نہیں ہیں۔ وہ کہتا ہے۔ ''ٹھیک ہے میں آزادی کا قائل ہوں، مگر چرس پینا بھی کوئی آزادی ہے؟ یہ تو ایسے ہی جیسے کوئی زہر کھائے اور کہے میں بغاوت کر رہا ہوں۔ چرس کے دھوئیں سے کیا سماج کے جابرانہ رشتے ٹوٹ جائیں گے! جب بڑے لوگوں کے بچے اسے حشیش کہہ کر پیتے ہیں تو مجھے اُن سے نفرت آتی ہے۔ یہ لوگ چرس اس لیے پیتے ہیں کہ مغرب میں آج کا دستور یہی ہے۔ صاحب لوگ ہیں بُرائی بھی 'ولایت پلٹ' کرتے ہیں۔ چرس پینا ہی اپنے لوگوں سے سیکھ لیتے تو کوئی بات بھی تھی......'' یہ درست ہے کہ مصنف بھی کبھی کبھار دوربین کی مدد سے لڑکیوں کو نہاتے دھوتے اور کپڑے بدلتے دیکھ لیتا ہے، مگر خود اُسی کے لفظوں میں ''وہ ایک غیر روایتی کردار ہے''۔ اُس کے اپنے اخلاقی معیار ہیں اور یہ نہایت صاف ستھرے، منطقی اور خالصتاً انسانی معیار ہیں۔

جو کچھ ماضی میں ہو چکا ہے اور جو کچھ حال میں ہو رہا ہے، اس سے وہ برگشتہ ہے اور اس نظامِ حیات کو منقلب کر دینا چاہتا ہے، جس میں نوجوانوں کے جذبات بھی محکوم بنا لیے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بعض مسلمہ حقائق کو بھی مغالطے قرار دے ڈالتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ ''موسیقی بھی کتنا خوبصورت دھوکا ہے'' اور ''حسن ایک اضافی اور بے معنی شے ہے'' اور انسانی رشتوں کی ایک مروجہ اصطلاح 'بے وفائی' کے بارے میں اُس کا کہنا ہے کہ ''بھائی یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ انسان کسی کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہیں جاتا...... بلکہ وہ ایک صورت حال سے دوسری میں چلا جاتا ہے......'' اس آخری مغالطے کو ختم کرنے کی کوشش میں مصنف خود اِس کی لپیٹ میں آ گیا ہے اور اُس نے کنول کی بے وفائی کا جواز مہیا کر دیا ہے۔ مگر یہ اُس زمانے کا ذکر ہے، جب اُن کی محبت عروج پر تھی۔ کتاب کا آخری باب لکھنے کے بعد راجہ انور کو اپنے اِس نقطہ پر نظر ثانی کر لینی چاہیے۔

بہر حال یہ طے ہے کہ مصنف کی محبت بھر پور ہے، جو کسی سے جھوٹ بولنا گوارا نہیں کرتی۔ کہتے ہیں کہ جنگ اور عشق میں سب جائز ہوتا ہے، مگر راجہ انور کم سے کم عشق کے معاملہ میں اِس مفروضے کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے اور اس کے معیاروں کو عظمت اور پاکیزگی بخشتا ہے۔ عظمت اور پاکیزگی کے الفاظ میں نے بہت جھجک سے استعمال کیے ہیں، کیونکہ راجہ انور کو لفظوں سے بہت شکایت ہے۔ وہ تہذیب، شرم اور حیا کے لفظوں کو 'بانجھ الفاظ' کہتا ہے۔ پھر ایک جگہ لکھتا ہے کہ ''لوگ بنجر الفاظ کے آہنگ سے یوں بہل جاتے ہیں جیسے بھوکا بچہ انگوٹھے سے۔'' اُس نے بعض دانشوروں کو 'مردہ الفاظ کے قبرستان میں بسنے والے گورکن' قرار دیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے ''میں الفاظ کی دنیا سے بہت دُور بہت پرے پہنچ چکا ہوں۔'' میں نے لفظ کے روایتی استعمال کے خلاف راجہ انور کی اِس کھلی بغاوت کی قدر کرتا ہوں۔ اس نے معیارِ محبت کے ساتھ جو عظمت اور پاکیزگی منسوب کی ہے وہ اتنی روایتی نہیں ہے خود راجہ انور کی محبت کی طرح توانا اور بامعنی ہے۔

(جنگ راولپنڈی ۱۳/مارچ ۱۹۷۴ء)

دِل کی بات

انسان کی ساری تاریخ بھی جمع کردی جائے تو محبت کی سائنس مرتب نہیں کی جاسکتی۔محبت کی اِس روئیداد میں مجھے موجودہ دھیان اور آنے والے جدید انسان کی جھلک نظر آتی ہے۔ہماری تاریخ بیداری کی ایک زبردست لہر سے گزر رہی ہے۔ نئے لوگ جنم لے رہے ہیں۔نئی زبان وجود میں آرہی ہے۔ دوسری جانب موت کا ایک رقص جاری ہے جس میں ایک بیمار سا حسن بھی ہے اور بھیانک قباحت بھی۔راجہ انور آنے والے دور کا نقیب ہے اور آج کے المیے کا نمائندہ بھی۔کنول زوال پذیر طبقے کی علامت ہے۔وہ بھلا پیار کا مفہوم کیوں کر سمجھے گی۔اس میں وہ رُوحانی وحدانیت ہی نہیں، جو بنیادی شرط ہے......دل کو ایک پوری اکائی بنانے کے لیے......محبت میں مبتلا ہونے کے لیے......

زندگی اور موت بہت قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے بہت دُور بھی ہیں۔اِسی طرح راجہ انور اور کنول دراصل دو مختلف دنیاؤں کے بسنے والے ہیں۔یوں نظر آتا ہے جیسے وہ موت کے سرہانے کھڑا نئی دنیا اور نئی محبتوں کے گیت الاپتا رہا۔کنول یہ مدھر گیت سن ہی نہ سکتی تھی کیونکہ موت اندھی ہونے کے ساتھ ساتھ بہری بھی ہوا کرتی ہے۔

راجہ انور نے اپنی شخصیت کا پہلا بھرپور اظہار سیاست میں کیا۔مصنف کی حیثیت سے ''بڑی جیل سے چھوٹی جیل تک'' اُس کی پہلی تصنیف تھی جس میں اُس نے معاشرے کے رشتوں کو رد کر دیا تھا۔آج بھی وہ اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔اُس کی زندگی کا یہ سارا عرصہ میرے سامنے ہے۔جس میں ہم اُستاد اور شاگرد کی بجائے ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔زیرِ نظر مجموعہ کے پسِ پشت موجود المیے کی بہت ساری جزئیات کا مجھے ایک دوست کی حیثیت سے علم ہے۔وہ جس شدید کرب سے زندہ گزر آیا ہے، یہ اُسی کا حوصلہ تھا۔

پروفیسر نصر اللہ ملک
گورڈن کالج، راولپنڈی
۷ مئی ۱۹۷۴ء

یہ ہے راجہ انور

اعزاز احمد آذر

ذوالفقار علی بھٹو کی شخصیت سے متاثر اور بے نظیر بھٹو کے متاثرین میں شامل راجہ انور، پچھلے بہت سے برسوں کے دوران ایک افسانوی کردار کی حیثیت میں جانا جاتا تھا۔ ضیاء الحق کے عرصۂ حکمرانی کے دوران اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے مطابق کبھی اسے کابل میں گولی سے اُڑا دیا جاتا تھا، کبھی پھانسی کی سزا دے دی جاتی تھی اور کبھی انگلستان میں بجلی کی کرسی پر بٹھا کر سزائے موت دے دی جاتی تھی۔ اخبارات ہر دوسرے چوتھے روز اس کی موت کی خبر شائع کر دیتے، مگر کبھی یہ نہ ہوا کہ کسی اخبار نے پندرہ سولہ مرتبہ سزائے موت دینے کے حوالے سے اپنی کسی خبر پر معذرت کی ہو۔ خدا معلوم یہ خبر رساں ایجنسیاں تھیں یا کوئی اور ایجنسیاں۔ مگر پھر یوں ہوا کہ لوگوں کی دلچسپی راجہ انور کے حوالے سے بڑھ گئی۔

ریاست، سیاست، صحافت، ادب اور محبت راجہ انور کے پسندیدہ میدان اور موضوعات ہیں۔ ایک گہری Conviction اور واضح کمٹمنٹ کے ساتھ وہ اِن موضوعات پر بات کرتا اور قلم اُٹھاتا ہے۔ انسانی سماج کی بے چہرگی، بے سمتی اسے تکلیف دیتی ہے۔ وہ اپنی فکر، اپنی سوچ اور اپنے قلم کے ذریعے اس بے سمتی اور بے چہرگی، کو ایک واضح رُخ اور پہچان دینا چاہتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ ہمارے سماج اور ہمارے نظام کی تہذیب ہو جائے۔ اس نے 8 دسمبر 1972ء کو ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> ''اپنی سوسائٹی ان باتوں پر شرمندہ ہو جاتی ہے، جن پر نہیں ہونا چاہیے۔
> لیکن ان باتوں پر قطعاً شرمندہ نہیں ہوتی، جن پر اسے شرمندہ ہونا چاہیے۔
> مثلاً عورت اور مرد کا ملاپ، فطری حقیقت ہے اور اس حقیقت سے شرمانا

ایک غیر فطری رویہ ہے، لیکن رشوت، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی اور دولت
کے انبار بغیر شرمائے ہی اکٹھے کیے جاتے ہیں۔ان بُرائیوں پر کوئی شرمندہ
نہیں ہوتا۔''

(اقتباس از''جھوٹے روپ کے درشن'')

راجہ انور کا قلم ہمہ جہت اور ہمہ صفت ہے۔اس کی تحریر''سنجیدہ شگفتگی'' اور''شگفتہ سنجیدگی'' کا ایک خوبصورت مرقع ہوتی ہے۔اس کی کتاب''جھوٹے روپ کے درشن'' اس کے دل، اس کے دماغ، اس کے عزائم اور اس کے''طریقہ واردات'' کو سمجھنے کا بہترین وسیلہ ہے۔زمانۂ طالب علمی اور عرصۂ قیام ہاسٹل کے دوران یا ان حوالوں سے اب تک لکھی جانے والی کتابوں میں''جھوٹے روپ کے درشن'' سب سے عمدہ کتاب ہے۔یہ ایک طرف یونیورسٹی اور ہاسٹل کلچر کا منظر نامہ ہے، تو دوسری جانب نوجوانوں کے لیے''ہدایت نامہ'' اور رہنما گائیڈ'' قسم کا فریضہ بھی ادا کرتی ہے۔

محترم قارئین! آپ تو جانتے ہیں، عیسائیت میں اپنے پچھلے گناہوں سے پاک ہونے کے لیے Confession کا طریقہ مروج ہے۔جس میں متعلقہ شخص پادری کے سامنے اپنی بداعمالیوں کا اعتراف کرتا ہے اور آئندہ ایک صاف ستھری زندگی گزارنے کا عہد کرتا ہے۔ہمارے مسیحی دوست کنول فیروز نے بتایا کہ ایسا ہی ایک نوجوان اپنے ساتھ اخلاقی مدد کے لیے ایک دوست کو لے کر کنفیشن کے لیے پادری صاحب کے پاس حاضر ہوا۔دوست کو باہر انتظار کرنے کے لیے بٹھا دیا گیا۔کنفیشن کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے، پادری صاحب نے اُس نوجوان سے پوچھا''اچھا تو کیا تم نے جن لڑکیوں سے دوستی کی اُن میں ریٹا تھی؟'' نوجوان نے پوچھا''ریٹا کون؟'' پادری صاحب نے بتایا''وہی، ڈیوڈ کی بیٹی، جو فلاں گلی میں رہتے ہیں۔'' نوجوان نے کہا''نہیں سر! وہ نہیں تھی۔'' پادری صاحب نے پوچھا''تو کیا مارتھا تھی؟'' نوجوان بولا''مارتھا کون؟'' پادری صاحب بولے''وہ جو جوزف کی بیٹی ہے، جن کے گھر کے سامنے بیری کا درخت ہے۔'' نوجوان نے انکار کر دیا۔انھوں نے کہا''تو کیا روزی سے تمھاری دوستی رہی ہے؟ جن کا نکڑ پر گرین گیٹ والا گھر ہے۔'' نوجوان نے پھر انکار کر دیا۔پادری صاحب نے اِسی طرح تین چار اور نام لیے مگر

نوجوان انکار کرتا رہا......اور پھر پادری صاحب سے معذرت کر کے اور یہ کہہ کر...... کہ وہ پھر کسی وقت دوبارہ حاضر ہوگا۔ باہر چلا آیا۔ باہر بیٹھے دوست نے خوش ہو کر پوچھا، ''کیوں بھئی ہو گیا کنفیشن؟'' نوجوان نے کہا، ''کنفیشن کو گولی مارو۔ پانچ چھ ایڈریس اور مل گئے ہیں......!!''

'جھوٹے روپ کے درشن' کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسے پڑھنے والے نوجوانوں کو وہی خوشی ملتی ہے، جو کنفیشن والے اُس نوجوان کو ملی تھی۔

(یہ مقالہ 1998ء میں 'جھوٹے روپ کے درشن' کی سلور جوبلی کے موقعہ پر پڑھا گیا۔)

محترمہ!

تم حیران تو ضرور ہوگی کہ اچھا بھلا چلتے پھرتے اِس شخص کے دماغ میں کیوں فتور آ گیا ہے؟ سچ جانو میں خود اِس 'کیوں' کا جواب ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گیا ہوں۔ شاید اِس کا جواب سرے سے ہے ہی نہیں۔ مجھے کہاں سے ملتا؟ پھر تمھیں کیسے دوں؟

یوں تو ہم دن میں کئی بار ملتے ہیں۔ دنیا بھر کی باتیں ہوتی ہیں...... کسی نئے 'افیئر' سے لے کر...... ویت نام تک ہر موضوع پر گرما گرم بحثوں کی آندھیاں چلتی ہیں...... مگر تم نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ دنیا کے ہنگاموں سے بہت دُور، میں نے کئی راتیں تم سے متعلق سوچتے سوچتے گزار دیں۔ ہر رات میں نے ہزاروں منصوبے باندھے...... اور آنے والی صبح نے ہر بار میرا حوصلہ چھین لیا...... تم سے اتنا بھی نہ کہہ پایا کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ بھلا، یہ بھی کوئی خوف کھانے والی بات تھی؟ میں نے خط کی بجائے، آج تم سے بات ہی کر لی ہوتی، مگر تمھاری سہیلی شاہدہ فوراً ہی آ گئی...... اور وہ تمھارا ایسا سایہ ہے، جو اندھیرے میں بھی موجود رہتا ہے...... ہمیشہ کی طرح مجھے ضبط کرنا پڑا۔ سوچا اُس کے سامنے بات کروں تو تم کہیں بُرا ہی مان جاؤ...... دوسروں کی موجودگی میں اکثر اُن باتوں کو بھی بُرا فرض کر لیا جاتا ہے جنھیں لوگ، ویسے بُرا نہیں سمجھتے۔ ہم بھی کیا لوگ ہیں، بے جان روایتوں کے قبرستان میں دفن۔ تہذیب، شرم اور حجاب ایسے بانجھ الفاظ کے سحر میں گرفتار...... زندہ لاشیں!

اُن دنوں پورب (بنگال) پر یحییٰ خان کی یلغار جاری تھی۔ اُبلتے ذہنوں پر مارشل لا کا وزنی پتھر ڈال دیا گیا تھا۔ ہم کوئی پچاس ساٹھ لڑکے شعبۂ فلسفہ کے ایک کمرے میں بیٹھے، اِس نازک سیاسی صورت حال کا تجزیہ کر رہے تھے۔ میں بحث سمیٹنے راسٹم پر پہنچا۔ ابھی بول ہی رہا تھا کہ تیز تیز آنکھوں، کٹے بالوں اور متناسب قد و قامت کی ایک لڑکی، اپنے 'سائے' سمیت اندر آئی...... اُس

خوبصورت لمحے پھسلتے الفاظ کو میں بمشکل تھام پایا۔ ذہن میں تیزی سے خیال اُبھرا کہ کوئی راستہ بھٹک کر یہاں آن نکلا ہے...... پھر خواہش نے سر اُٹھایا کہ یہ لڑکی اگر بھٹک کر اِدھر آ ہی گئی ہے تو پھر تھوڑی سی اور بھٹک جائے...... اور وہ واقعی بھٹک گئی۔ وہ میرے سامنے بائیں ہاتھ والی قطار کے آخری سرے پر بیٹھ گئی۔ 'سایہ' بھی قریب ہی دوسری کرسی پر جم گیا۔ میں نے بھٹکتے خیالات کو یکجا کیا، اور دوبارہ الفاظ کی دُنیا میں کھو گیا۔ کسی انتہائی جذباتی فقرے پر، نیم جان آنکھیں اُبھریں، تالیوں کا طوفان اُٹھا...... اور میں دم لینے کو پل بھر رُکا۔ عین اس لمحے ایک جان دار نقرئی قہقہہ فضا میں لڑھکا۔ وہی لڑکی اپنے سائے سے کوئی بات کر کے کھلکھلائی تھی۔ خشکی کی حد تک سنجیدہ ماحول میں ہنسنے کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی۔ قریب قریب سبھی نے اس قہقہے کو محسوس کیا۔ چند پیشانیوں پر لکیریں اُبھریں، چند ویسے کے ویسے سر جھکائے بیٹھے رہے...... کچھ نے فوراً گردن پیچھے گھمائی کہ نقرئی ترنم بکھیرنے والی آبشار دیکھ سکیں۔ میں بھی تھوڑی دیر تک اِس آواز کی صداقت میں ڈوب سا گیا۔ میں نے سوچا گھمبیر اداسیوں اور بوجھل دُکھوں کے اِس دور میں یہ لڑکی اتنی انمول خوشیاں اور بے ساختہ قہقہے کہاں سے لائی ہے؟

اِس لڑکی نے کانوں میں خاصے بڑے بڑے بالے ڈال رکھے تھے۔ بالکل میری ماں کے ایسے چاندی کے بالے...... جن سے کھیل کر میرا بچپن گزرا تھا...... میں نے ذرا غور سے دیکھا تو وہ مجھے کوئی ہندو دیوی لگی۔ یوں تو وہ خاصی ماڈرن تھی مگر اُس کے چہرے پر نظر نہ آنے والی کوئی ایسی جاذبیت تھی، جو اُسے منفرد بنائے ہوئے تھی۔

میں یہ نہیں کہتا، میں بس اُسی لمحے گھائل ہو گیا تھا۔ تاہم ایک حد تک دلچسپی ضرور پیدا ہوئی...... کہیں دُور، اندر کسی کونے میں ہلکا ہلکا سا خمار چھایا۔ یہ ساری کیفیت محض حادثاتی تھی...... تمھارا نام جاننے کی حد تھا۔ بس یوں ہی سی، جو کسی بھی شخص میں، کسی بھی شاداب چہرے کو دیکھ کر اُبھرا کرتی ہے۔ قطعاً فطری سی، لمحاتی سی۔

پھر یونیورسٹی میں الیکشن کا طوفان اُٹھا۔ ہر کونے سے ''سبز ہے''، ''سرخ ہے'' کے نعرے بلند ہونے لگے۔ تم اُن دنوں، سرخ دوپٹہ اوڑھے، سُرخ پرچم تھامے، ہمارے جلوس کے آگے آگے...... چلا کرتی تھیں۔ ایک شام ہمیں انتخابی تقریریں کرنے لیڈیز ہاسٹل جانا تھا...... مخالف

روپ کی لڑکیوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ تم پیٹ پر ہاتھ رکھ کر پورے ''زور سے زندہ باد۔ آوے ای آوے''، کے نعرے لگا رہی تھیں۔ جلد ہی مخالف پارٹی دب گئی ...... اور جلسے پر تمھاری سہیلیوں کا قبضہ ہو گیا...... شاید میں اُسی زمانے میں تم سے متاثر ہوا...... اور پسندیدگی آہستہ آہستہ، چاہت کے میٹھے میٹھے درد میں بدلتی رہی ...... ایک دن تم ایک لڑکے سے بہت خوش خوش گپیں لگا رہی تھیں۔ جانے مجھے کیوں اچھا نہ لگا؟......

یہ سارے حادثات، ایک حادثے میں بدل گئے اور جب میں نے اس حادثے کو اپنی ذات کے رشتے میں جوڑا...... تو میں ننگا ہو گیا۔ مجھے پہلی بار اپنے وجود سے دہشت آئی ...... ایک اجنبی سا احساس ہوا۔ ننگا ہو کر، انسان خوبصورت لگتا ہے، نہ بدصورت، بلکہ کچھ اور سا لگتا ہے...... عجیب سا...... ناقابلِ بیان سا...... اس ننگے پن نے مجھے 'اپنے' ہونے کا احساس دیا اور اس دورِ خرابی میں 'ہونا' بہت مشکل میں 'ہونا' ہے میری سرکار......

میرا کزن بھی مجھے خراب کر گیا۔ ہمہ وقت میرے شعور پر تمھارے اچھا ہونے کے کچوکے لگاتا رہا...... پہلے تو میں سمجھا شاید وہ خود دلچسپی لے رہا ہے۔ اُس وقت تک بات پسندیدگی کی حد سے آگے نہ سرکی تھی۔ میں خوش بھی ہوا کہ اس اکھڑ کو بھی بالآخر کوئی پسند آ ہی گیا۔ اُسے تمھارا جامنی سوٹ بہت پسند ہے جس میں بقول اُس کے تم بہت اچھی لگتی ہو...... پھر اُس نے مجھے محسوس کرانا شروع کیا، وہ خود کچھ نہیں چاہتا بلکہ اُس کی خواہش ہے کہ میں تم سے بات کروں ...... جانے کیوں؟ میرا کزن دنیادار ہے۔ بے چارہ تمھارے جامنی سوٹ سے آگے نہ رینگ پایا۔ پر مجھے تو سب کچھ اِس کے برعکس لگا۔ جامنی رنگ تو اس لیے نکھرتا ہے کہ تم اِسے پہنتی ہو۔ تمھارے وجود کے لمس سے آشنا ہوتا ہے...... ورنہ بے کار رنگ ہے...... محض بے جان...... اور...... بے نور......

میرے پاس رکھا ہی کیا ہے جو میں تمھیں فخر سے پیش کروں۔ اپنی صورت سے لے کر دنیاوی دولت تک، ویرانیوں کے سوا کچھ بھی نہیں میرے پاس! کس کو یہ ضرورت پڑی کہ میرے راکھ راکھ ماضی کو اپنائے، بے رنگ حال کو اپنے وجود کے لمس سے جامنی کر دے یا پھر اندھیروں سے زیادہ تاریک مستقبل میں میرے لیے چراغِ راہ بنے۔ مجھے جن لوگوں نے جنم دیا اُن کا اپنا کوئی ماضی تھا، حال ہے اور نہ مستقبل۔ مجھے کیا دیتے بے چارے؟ اُن کا کیا تصور کہ ان کو جنم دینے

والے بھی اِسی طرح بے حال اور کنگال ہوئے ہوں گے۔ میں انسان ہوں۔ صدیوں سے یوں ہی گم نام پیدا ہوتا چلا آیا ہوں۔ میرا مذہب، تاریخ اور نام مفلسی ہے...... میرے ہاتھ میں اپنے لہو بھرے کپڑے ہیں...... میری ساری کائنات بس اتنی سی ہے...... خلا کی بلندیوں پر بیٹھے خدا کے نام پر مجھے بار بار ذبح کیا گیا...... مگر مجھے اُس سے گلہ ہے نہ اُس کے بندوں سے......

میں تم سے کوئی چکر نہیں چلانا چاہتا...... اگر تمھاری منگنی وغیرہ نہ ہو چکی ہو تو شادی کے متعلق ذرا سوچنا...... مگر روایتی شادی نہیں۔

ہمارے یہاں شادی تو ایک جنسی کاروبار ہے۔ چھوٹے لوگ چھوٹی دکان سے اور بڑے، بڑی دکان سے جنس خریدتے ہیں...... زندگی سے بے بہرہ پروہت سمجھتا ہے، جیسے اُس کے جنتر منتر سے خریدی ہوئی جنس پوتر ہو گئی ہے......

بھولے لوگ بنجر الفاظ کے آہنگ سے یوں بہل جاتے ہیں، جیسے بھوکا بچہ انگوٹھے سے! کون انھیں سمجھائے کہ بچہ پیدا کرنا تو مقدس فریضہ ہے...... پروہت نہ تھا تب بھی بچے پیدا ہوا کرتے تھے ورنہ ہم کہاں ہوتے؟ میں شادی کو ایک معاشرتی اعلان سمجھتا ہوں...... جو یونیورسٹی کے عین وسط میں کھڑے ہو کر بھی کیا جا سکتا ہے...... باقی سلسلے خرید و فروخت کے ہیں ان پر میں یقین نہیں رکھتا...... کہو کیا خیال ہے؟

جانتی ہو ایک بات نے مجھے ہمیشہ پریشان کیے رکھا۔ تم بہت بڑے باپ کی بیٹی ہو۔ تم نے ہوائی جہاز کی سیٹوں اور ائیر کنڈیشنڈ کمروں میں زندگی کاٹی ہے...... تمھارے لیے غم کی شدید ترین نوعیت، شاید کبھی کار کا خراب ہو جانا ہو۔ تمھیں معاشی طور پر کسی چیز کی کمی نہیں...... پھر تم کیوں ہم جیسے لوگوں کے ساتھ مل کر اپنے اجداد کے خلاف نعرے لگاتی ہو؟...... ہم سے تو ہماری انسانیت چھینی گئی ہے۔ زندہ رہنے کا حق مانگتے ہیں۔ تم سے کیا چھنا؟

جواب کی توقع رکھوں؟

تمھارا ساتھی

انور

نیو کیمپس پنجاب یونیورسٹی

۱۳/ مئی ۱۹۷۲ء

۱۲۹۔ سرسید ہال

لڑکی

پرسوں شام پیغام آیا کہ ہاسٹل آ کر تم سے ملوں۔ سچ جانو، وہ رات میں نے کروٹیں بدلتے گزار دی۔ خوشی اور خوف باہم دست و گریبان رہے۔ خوشی تھی کہ تم سے مَن و تُو کے سلسلے چھیڑیں گے اور خوف تھا کہ جانے کیا بنے؟

تمھارے آنے سے پہلے شاہدہ ملک نے مجھے تفصیل سے تمھارے متعلق بتایا کہ تمھاری منگنی تمھارے کزن سے ہو چکی ہے۔ وہ فوج میں میجر ہے۔ مگر تمھارے من مندر کا دیوتا کوئی سی ایس پی ہے۔ پہلے یہیں پڑھا کرتا تھا۔ کسی بڑے خاندان کا خوش قسمت بیٹا ہے۔ تم چار بہنیں ہو، چھوٹی دونوں پڑھ رہی ہیں۔ سب سے بڑی کی شادی ہو چکی ہے۔ اب تمھاری باری ہے۔ تمھارے ڈیڈی ایک بڑے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ تمھارا کوئی بھائی نہیں، اس لیے وہ تم بہنوں کے متعلق بہت حساس ہیں۔ یوں بھی خاصے سخت مزاج ہیں۔ تمھاری پہلی منگنی ابھی نہیں ٹوٹی اور ہو سکتا ہے کہ تم سی ایس پی کو بھی نہ پا سکو۔ سب کچھ تمھارے ڈیڈی کے موڈ پر منحصر ہے۔

جب تم آئیں، میں کوئی بات نہ کر پایا اور شاید کچھ کہنے کی گنجائش بھی نہ رہی تھی۔ اُوپر سے تم اتنی نروس ہو رہی تھی، بمشکل تمھارے منہ سے ایک ادھورا سا جملہ نکلا ''میں بھی آپ کو بہت اچھا سمجھتی ہوں اور آپ کی عزت کرتی ہوں مگر......'' اور میں تم دونوں کو خدا حافظ کہہ کر اُٹھ آیا۔

اب مجھے یوں واپس آنے کا احساس ہو رہا ہے۔ جانے تم نے کیا سمجھا ہو گا؟...... تمھاری قسم، میں بالکل ناراض نہیں ہوں اور نہ تمھیں دل میلا کرنے کی کوئی ضرورت ہے۔ کیا ہوا جو تم میری نہیں بن سکتیں، ہم دوست تو ہیں۔ یہی کیا کم ہے؟ اور پھر ضروری نہیں ہر خواب حقیقت میں

بدل جائے۔ میں محرومیوں کا زہر پی پی کر جوان ہوں تم اُجالوں کی باسی، میں تاریکیوں کا مسکن، تم فضاؤں میں گونجتا قہقہہ، میں آہوں سے اُٹھتا دُھواں...... بھلا ملاپ کیسے ممکن ہوتا؟ میں دُکھوں کا کشکول تھامے جانے کب سے زندگی کی شاہراہ پر چل رہا تھا...... تمھارا بھلا ہو کہ تم نے اسے ایک ہی بار بھر دیا۔ اب زندگی سکون سے کٹتی رہے گی، پھر اپنوں کے دیئے دُکھ تو بہت عزیز ہوا کرتے ہیں۔ میں تم سے صرف اتنی سی بات کہنا چاہتا ہوں کہ زندگی کے کسی موڑ پر تمھیں میری ضرورت پڑے تو مجھے سر جھکائے اپنے اردگرد ہی پاؤ گی۔

''اچھا سمجھنے'' کا شکریہ۔ میں بھی تمھاری بہت قدر کرتا ہوں۔ میں احسان فراموش نہیں۔ تم نے اِس دیش کے مفلس بیٹوں کا پرچم تھاما۔ الیکشن والی رات، برستی گولیوں میں بھی تم ہمارے ساتھ تھیں۔ اِس دنیا میں مجھ سے کہیں زیادہ محروم اور دُکھی لوگ بستے ہیں۔ میں نے تمھیں اپنانے کی خواہش تو کی، وہ غریب خواہش تک نہیں کر سکتے۔ ان سب کے لیے لڑتی رہنا۔ میں سمجھوں گا میں نے تمھیں پالیا ہے۔ چند لمحات کی زندگی میں اِس سے زیادہ کچھ نہیں مانگتا۔

آج تمھاری جانب آنے کا پروگرام تھا۔ ابھی ہاسٹل ہی میں تھا کہ جھگڑے کی اطلاع ملی۔ میں اور رؤف (عطی) بھاگم بھاگ ڈیپارٹمنٹ پہنچے۔ آگے نقشہ ہی بگڑا ہوا تھا۔ لاٹھیاں اور فائرنگ...... کوئی گیارہ بجے پولیس نے یونیورسٹی کو گھیرے میں لے لیا...... ہمارے گروپ کے جاوید علی خان اور عارف راجہ بہت شدید زخمی ہیں۔ ابھی ابھی انھیں ہسپتال چھوڑ کر آرہا ہوں۔ تمھارے متعلق پوچھ رہے تھے اور وہاں پر موجود سبھی ساتھی پریشان تھے۔ کچھ اخبار نویس بتا رہے تھے کہ تمھارے شعبے میں جماعت اسلامی والوں نے لڑکیوں کو بھی ڈنڈے مارے اور کوئی دو لڑکیاں زخمی ہوگئی ہیں۔ خدا کرے تم خیریت سے ہو۔ میں نے کزن کو ہاسٹل دوڑایا کہ وہ پتہ کرکے آئے اور ہاں، جماعت اسلامی کے بھی چار لڑکے ہسپتال میں پڑے ہیں۔

بہت ممکن ہے پولیس دونوں پارٹیوں میں سے کچھ لوگ گرفتار بھی کرے۔ خیر یہ کچھ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ اپنی زندگی میں ویسے بھی کیا حسن ہے جو جیل جا کر کھو دیں گے۔

ویسے، خبر یہی ہے کہ ہنگامے کی وجہ سے یونیورسٹی ایک لمبے عرصے کے لیے ایک بار پھر چپ

کی چادر تانے گی۔ ہاسٹل بھی غیر معینہ مدت کے لیے خالی کرائے جائیں گے۔ اگر چھٹیاں ہوگئیں تو تمھارا کیا پروگرام ہے؟ میں تو اِن حالات میں گھر نہیں جا سکتا۔ یہ خط تمھیں اپنے ایک دوست کے ہاں سے بیٹھا لکھ رہا ہوں...... میرا خیال ہے تمھیں کل تک مل جائے گا۔ چلو خیر، یونیورسٹی بند بھی ہوگئی تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ سوائے اس کے کہ تم کو نہ دیکھ سکیں گے۔

پیار

۱۴/۱۴ اکتوبر ۱۹۷۲ء
۱۲۹۔ سرسید ہال

دیوی جی

کتنا پیارا لفظ ہے مٹھاس سے بھرپور۔ جانتا ہوں میں شُودر ہوں۔ یہ مقدس لفظ میری زبان پر نہیں آنا چاہیے۔ اگر ذرا سی اجازت ہو تو کبھی کبھار سرگوشی کے انداز میں دیوی جی کہہ کر بلا لیا کروں۔ آج کے تہذیب یافتہ دور میں ہم شُودروں کو اتنی سی آزادی تو ملنی چاہیے۔

گرما کی چھٹیوں کا طویل زمانہ آخر بیت گیا۔ یونیورسٹی صبح کے وقت کسی طوائف کے اُجڑے چہرے سے بھی زیادہ بے رونق ہوا کرتی تھی۔ میں نے خزاں کی ساری ویرانیاں یونیورسٹی کے برآمدوں میں تنہا بیٹھ کر گزار دیں۔ صرف دس پندرہ دنوں کے لیے پنڈی جانا ہوا...... رات کے وقت میگزین کا کام کرتا اور صبح یہاں آ کر گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھا کرتا...... توبہ ہے! لوگ نہ ہوں تو یونیورسٹی قبر سے بھی زیادہ خوفناک ہے۔

پرسوں شام جوں ہی تمھاری واپسی کی خبر پھیلی میں اور تنویر صابر اُسی وقت درشن لینے تمھارے ہاسٹل پہنچ گئے۔ دیکھ لو، ہم تو پھریوں ہی نازل ہوا کرتے ہیں۔ ساتھ صبیحہ چپکی پڑی تھی۔ اُس کے سامنے بھلا کیا خاک بات ہوتی؟ کیفے میں چائے پیتے ہوئے میرا دل چاہ رہا تھا، اُسے اُٹھا کر نہر میں پھینک دوں...... تا کہ پوری آزادی سے تمھیں دیکھ تو سکوں۔

جانتی ہو پنڈی والے فنکشن میں تمھیں بلوانے کے لیے کتنا بھاگنا دوڑنا پڑا؟ یہ سارا معرکہ تنویر صابر نے سر کیا۔ جانے کیسے اور کہاں سے تمھارا ایڈریس نکال لایا۔ پھر نیا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ سوچا اگر ہم لوگ خط لکھیں تو تمھارے لیے کسی پریشانی کا باعث ہی نہ بن جائے۔ ہمارے بزرگ اپنی بیٹیاں تو مخلوط درس گاہوں میں بھیج دیتے ہیں۔ لیکن یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ وہ لڑکوں کے ساتھ پڑھتی ہیں اور یہ جوان لوگ ایک دوسرے کے دوست بھی ہو سکتے ہیں۔ تنویر نے قلم بائیں

ہاتھ میں لیا اور لڑکیوں جیسے انداز میں تمھیں خط لکھ مارا۔ یہ شیطان تو جیسے اِس طرح کے خط لکھنے میں ماہر ہے۔ ہمارے بزرگ بھی روایات کے معمے ہیں۔ سوچتے ہوں گے انھیں نے ہمارے راستے بند کرر کھے ہیں۔ انھیں کیا خبر جوان لوگ بہتے پانی کی طرح اپنا راستہ آپ بنا لیا کرتے ہیں۔

فنکشن والے دن، آخری لمحے تک تمھارا انتظار ہوتا رہا۔ ہر آہٹ پر دل کی دھڑکنیں تیز ہوئیں۔ تمھارا معذرت نامہ تو دوسرے روز ملا۔ پتہ چلا، پہلے ایبٹ آباد کی سیر ہوئی، وہاں دل نہ لگا تو مری کی فضائیں تمھارے وجود کی خوشبو سے مہکیں۔ کتنی خوش نصیب ہیں وہ بلندیاں جو تمھارے قدموں کی دھول ٹھہریں۔

ایک تو اِس میگزین نے میری جان کھا رکھی ہے۔ وہاں سے فارغ ہو کر آج ایک بجے یونیورسٹی پہنچا تو کسی نے بتایا کہ تم اور شاہدہ میری تلاش میں دو دفعہ میرے ڈیپارٹمنٹ میں آئی تھیں۔ میں تم دونوں کو ڈھونڈتا پھرا...... اور کوئی دو بجے صرف شاہدہ سے ملاقات ہو سکی۔ اُس نے بتایا تم ذرا پریشان سی تھی۔ کسی پارٹی میں تم نے اپنے نام کے ساتھ میرا ذکر چلتے سنا۔ تمھاری کوئی سائرہ نامی سہیلی ہے اُس نے تمھیں یہاں تک بتایا ہے کہ وہ میری بھی دوست ہے اور میں نے خود اُسے یہ بات بتائی تھی۔

لو یہ بھی خوب رہی، ارے بھائی کسی نے افواہ چھوڑی ہو گی!...... پریشانی کی کوئی وجہ نہیں۔ سائرہ نام کی صرف ایک عورت سے میری جان پہچان ہے۔ وہ یہاں سے کوئی دو سو میل دُور ایک اُجاڑ ویرانے میں بستی ہے۔ ہم سبھی گاؤں والے اُسے 'تائی سائراں' کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اُس کی اپنی اولاد بھی اُسے 'تائی' کہہ کر بلاتی ہے...... میرا خیال ہے، یہ بوڑھی بنگالن بیوہ تمھاری پارٹی میں نہ آئی ہو گی۔ اگر کوئی جوان 'سائرہ' ہے اور ہم سے دوستی کا دعویٰ بھی رکھتی ہے، تو پھر اُسے فوراً ہم سے ملوا دو...... یوں مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ افواہ صحرا میں برسی بارش کی طرح فوراً ہی اپنا اثر کھو دیا کرتی ہے، اس لیے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب ہم میں کوئی تعلق نہیں، تو پھر پریشانی بے معنی ہے...... اصل میں ہمارے لوگ بڑے ہمدرد اور غم گسار واقع ہوئے ہیں۔ ہمیشہ دوسرے کے متعلق سوچتے ہیں اور بڑے ہی خلوص سے بُرائی دوسرے کے کھاتے میں ڈالتے رہتے ہیں۔ یوں بھی

بہت مذہبی لوگ ہیں...... افواہ تو ایک کشف ہے، لہٰذا اسے مذہبی فریضہ جان کر ادا کرتے ہیں بے چارے! اگر تم زیادہ گھبرا گئی ہو، تو میں آڈیٹوریم کی بلند چھت پر کھڑا ہو کر اِس افواہ کے خلاف دو گھنٹے تقریر کرنے کو تیار ہوں۔

تیسری تجویز یہ ہے کہ افواہ کسی چیز کے ہونے اور نہ ہونے کے درمیانی عرصے میں اُڑا کرتی ہے...... لوگ بس جاننے کی حد تک دلچسپی لیتے ہیں۔ اگر اُن کے سامنے کچھ کر لیا جائے تو پھر افواہ نہیں اُڑاتے۔ کہو کیا خیال ہے؟

ویسے ایک بات ہے۔ کہیں تو تمھارے نام کے ساتھ اپنا ذکر بھی ہوا۔ جی چاہتا ہے افواہ اُڑانے والے کا منہ چوم لوں...... جانے کس نیک گھڑی اُس کے ذہن میں یہ خیال پھوٹا۔ واہ، واہ، لذت ہی آ گئی۔

چلو چھوڑو یہ سب خرافات ہے۔ کوئی اور بات سناؤ...... کسی اچھی سی بات کے لیے کان ترس گئے ہیں...... اگر اجازت ہو تو ایک معمولی سی افواہ میں بھی اُڑا لوں کہ میں نے تمھاری آنکھوں میں چاہت کے ہلکے ہلکے ڈورے دیکھے ہیں۔ کبھی آہستہ سے سر ہلا کر تصدیق کر دینا...... ہیں نا؟......

اس وقت رات کا ڈیڑھ بجنا چاہتا ہے۔ ہاسٹل کی فضا اپنی نسل کے بوجھل ذہنوں کی طرح...... وزنی سی دکھائی دے رہی ہے۔ کمروں کی روشنیاں بتدریج اندھیروں میں ڈوبتی جا رہی ہیں۔ سیاہ مستقبل کا خوف دل میں چھپائے، حال کی بے کیفی سے اُکتا کر اِس دنیا کے باسی، اچھے اچھے خواب دیکھنے نیند کی آغوش میں جا پہنچے ہیں۔

تھوڑی دیر پہلے تک ساتھ والے کمرے میں نوجوانوں کا جمِ غفیر موجود تھا۔ کچھ نادر تصویریں دیکھی جا رہی تھی۔ یار لوگ لیبارٹری سے مائیکروسکوپ اُڑا لائے تھے کہ اس کے ذریعے نشیب و فراز کو اتنا وسیع کر سکیں...... کہ اُن کی تشنہ ذات اِن ننگی تصویروں میں چھپ جائے۔ مائیکروسکوپ جس کے ہاتھ لگ جاتا اُس کی سانس پھول جاتی...... یوں نظر آتا جیسے وہ پگھل رہا ہو۔ اتنی دیر میں اُس سے کوئی دوسرا چھین لیتا۔ ایسی تصاویر بڑی پاپولر ہیں، اور بڑی محنت کے بعد ہی ہاتھ لگتی ہیں اس لیے نوجوان ان سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ یہ پڑھے لکھے لوگ بھی کتنے بددیانت ہوتے ہیں جو محسوس کرتے ہیں وہ کہہ نہیں پاتے، جو کہتے، وہ کرتے نہیں۔ اور جو کرتے ہیں، وہ صرف دھوکا

اور فریب ہوتا ہے۔ اُن کے پاس اپنے علم کے بہت سے چہرے ہیں جنھیں وہ موقع محل کی مناسبت سے پہنتے رہتے ہیں۔ اُن میں کفر کی ہمت ہے اور نہ مسلمانی کی، بے چارے فرشتے!

تم نے دیکھا نہیں یہ لوگ، اجداد کی عظمتِ رفتہ کے گیت گاتے تھکتے نہیں، کتنے زور سے چیخا کرتے ہیں۔ اخلاقِ حسنہ کی تبلیغ کرتے ہیں۔ مگر اُن کی اصل صورت کتنی بھیانک ہے۔ عورتوں کی آزادی سے اُن کی مراد ہمیشہ دوسروں کی عورتوں کی آزادی ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ یہ اپنی ماں، بہن اور بیوی کو عورت نہیں سمجھتے۔ ان کے سارے بوگس نظریات کے پیچھے ان کی اپنی ذات کی خواہشات چھپی ہوتی ہیں۔ مردہ الفاظ کے قبرستان میں بسنے والے گورکن۔

میں تم سے اکثر یہ باتیں کہتا رہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تم اُن کی بنائی ہوئی روایات کو پسند نہیں کرتیں۔ تم میں ......ان سے لڑنے کی سکت موجود ہے۔ تم زندگی میں جہاں کہیں بھی رہو......روایات کے کولہو کا بیل نہ بننا۔ میں نہیں جانتا پوری حقیقت کیا ہے؟ تاہم حقیقت کا آدھا حصہ میں نے پہچان لیا ہے......اور وہ یہ کہ جو کچھ ہمارے اردگرد ہو رہا ہے......غلط ہے......صحیح کیا ہے؟ اُس کا تعین ابھی مجھ سے نہیں ہو پایا۔ شاید یہ میرے دور کی مجبوری ہے کہ میں صرف آدھی سچائی جان سکا۔

میں سماجی زنجیروں کو توڑنا چاہتا ہوں، کیونکہ میں آزاد پیدا ہوا تھا۔ میں روایتوں کا دشمن ہوں، اس لیے کہ یہ روایتیں میں نے نہیں بنائیں۔ میں اخلاقی ضابطوں کو نہیں مانتا، اس لیے کہ یہ ضابطے میرے تخلیق کردہ نہیں۔ میں عقیدوں کے غباروں سے نہیں بہل سکتا اس لیے کہ میں ان کی حقیقت سے آشنا ہوں۔ میں خاندانی رئیسوں کی عزت نہیں کرتا، اس لیے کہ ان کے اجداد بادشاہوں کے خواجہ سرا تھے یا پھر انگریز کے کاسہ لیس۔ یہ زمینیں انھیں غداری کے عوض ملیں۔ اِس دولت پر ان کا کوئی حق نہیں۔ وہ دولت ماں کے پیٹ سے اپنے ساتھ نہ لائے تھے۔ یہ ہم غریبوں کا خون ہے۔

فطرت نے ہر انسان کو ذہن اور جسم دیا۔ سورج سب کے لیے روشنی کا پیامبر ہے۔ ہوا سب کے لیے زندگی کی ضامن ہے۔ جب بارش برستی ہے، تو امیر کا محل بھی بھیگ جاتا ہے اور غریب کا جھونپڑا بھی۔ انسان کی پیدائش کا عمل ایک ہے۔ اُس کی موت کا عمل ایک ہے۔ بھوک سب کو لگتی ہے،

تشنگی سب کو محسوس ہوتی ہے۔ دُکھ کا احساس سب کے لیے تکلیف دہ ہے۔ خوشی کی کیفیت سب کے لیے یکساں ہے۔ فطرت کی نعمتیں سب کے لیے عطیہ ہیں۔ جب فطرت کا سلوک مادر مہربان کی مانند مساوی ہے۔ جب فطرت کے نزدیک سب انسان برابر ہیں...... تو محض حادثۂ پیدائش کی بنیادوں پر کسی کو بڑا اور کسی کو چھوٹا کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا وہ بچے نہیں ہوتے، جنھیں مائیں چٹائی پر جنم دیتی ہیں؟ کیا وہ انسان نہیں ہوتے جو غریبوں کے گھر میں جنم لیتے ہیں؟ اگر کوئی ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں پیدا ہوتا ہے، تو اِس حادثے میں اُس کا اپنا کیا کمال؟ وہ جھونپڑے میں بھی اُگ سکتا تھا۔ یہ تفریق چند انسانوں کی پیدا کردہ ہے۔ امارات اور غربت خدا نے نہیں بنائی۔ خدا اتنا بے انصاف نہیں ہو سکتا۔ یہ تفریق سماج نے پیدا کی ہے۔ یہ غیر فطری، غیر انسانی اور غیر اخلاقی تفریق ہے۔ اسے ختم کرنا ہوگا۔ اسے مٹانا ہوگا۔ تاکہ نسل آدم اِس کرۂ ارض پر سکون سے سانس لے سکے۔ فطرت کے رازوں کو سمجھ سکے۔ کائنات کی قوتوں پر قبضہ پا سکے۔ یہی مقصدِ حیات ہے۔

زندگی صرف بچے پیدا کرنے کا نام نہیں بلکہ ان بچوں کو بہتر انسانی ماحول دینے کا بھی نام ہے۔ تمھاری شادی بھی ہو گی۔ بچے بھی پیدا ہوں گے...... پھر بڑھاپا...... اور آخر چل چلاؤ...... زندگی کتنی مختصر ہے! اس سانس برابر زندگی کو کار، بنگلے اور دولت کے بوجھ تلے دبا کر ختم کر دینا، یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ بچے تو بھینسیں بھی پیدا کر لیتی ہیں......

تم عورت ہو، کسی دن میری بات پر غور کرنا۔

اچھی تمناؤں کے ساتھ
تمھارا دوست

۱۷/۱/اکتوبر۱۹۷۲ء

۱۲۹۔ سرسید ہال

دیوی جی

شاہدہ مسکراتی، کھلکھلاتی کوئی دو بجے کے قریب کیفے ٹیریا پہنچی۔ میں لان میں اُسی درخت کے نیچے تنہا بیٹھا، تمھارے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔ اُس نے دور سے نعرۂ حیدری بلند کیا۔ کہنے لگی ''ساری یونیورسٹی چھان ماری ہے، اور آپ یہاں چھپے بیٹھے ہیں۔'' میں نے کہا، ''جانتی ہو، بُدھ نے ایک ایسے ہی درخت تلے نروان کا گیان پایا تھا۔ میری بے چین آتما بھی شانتی کی تلاش میں ہے۔'' اُس نے مسکراتی آنکھیں نچاتے ہوئے کہا ''گیانی مہاراج، اب تپسیا بند کیجیے، میں آپ کے لیے نروان کا سندیسہ لائی ہوں۔''

لیکن تمھاری اس داسی نے مجھے جی بھر کر ستایا۔ کہنے لگی 'خوشی کا پیغام ہے۔ پہلے منہ میٹھا کراؤ۔'' جب منہ میٹھا ہو چکا تو اُس نے عجیب سا منہ بنا کر کیفے والوں کو بددعائیں دیں کہ ہر باسی شے یہاں فروخت کرتے ہیں۔ سارا ذائقہ ستیاناس ہو کر رہ گیا۔ فوراً جوس پلواؤ۔ جوس سے فارغ ہو کر اُس نے اپنی آنکھیں ماتھے پر دھکیلتے ہوئے مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا، اور سکون سے بیٹھ گئی۔ چار پانچ منٹ گزرے تو میں نے تنگ آ کر کہا، ''اب کچھ پھوٹو بھی۔'' بس پھر کیا تھا، اُس نے میز پر مکے برسانے شروع کر دیئے۔ ''بیڑہ غرق کر دیا۔ آدھا پیغام اِس دخل در معقولات کے باعث ذہن سے فرار ہو گیا ہے۔ دو منٹ صبر نہیں ہو سکا۔ توبہ ہے اتنی بھی بے قراری کیا؟''

میں نے کہا ''تم یہیں بیٹھ کر مفرور پیغام کو تلاش کرو میں ہاسٹل چلتا ہوں۔ جب سب کچھ یاد آ جائے تو وہیں آ کر بتا دینا۔'' اُس نے جھپٹ کر میری کتابیں چھین لیں ''ادھر بیٹھیے۔ مجھے کیا آپ دونوں نے اپنا نوکر سمجھ رکھا ہے؟ 'صاحب' کی تلاش میں میرا ایک پیریڈ پہلے ہی ضائع ہو چکا ہے۔ رات بھر 'بیگم صاحبہ' مجھ غریب کو جگائے رکھتی ہیں۔ ہر وقت 'صاحب' کی تعریفیں، مجھے

پڑھنے دیتی ہیں نہ خود پڑھتی ہیں۔ میں کہتی ہوں، مجھے فیل کرانا چاہتے ہیں آپ لوگ۔''

میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا''بی بی مناسب وقت پر خدا تیری گود ہزار بار ہری کرے، اپنا بیان جاری رکھ۔''

شاہدہ نے بتایا، تم پرسوں کے دن کیمپس سے باہر مجھ سے ملنا چاہتی ہو۔ لیکن ہوٹل کی بجائے کوئی پرائیویٹ جگہ ہو، جہاں سکون سے بیٹھ کر بات چیت کرسکیں۔ اُس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں کہ اُس نے مجھ سے کیا کچھ کہا؟ شاید کہہ رہی تھی میں کل شام تک پروگرام بنا کر تمھیں اطلاع دوں اور اپنے متعلق بھی کچھ بتا رہی تھی۔ شاید اشرف کے ساتھ جائے گی، یا ہمارے ساتھ چلے گی۔ خیر تم اُس سے پوچھ لینا۔

اگر میرے مقدور میں ہوتا، تو تمھارے نامہ بر کے ہر لفظ پر میں اُسے آبِ حیات کا پیالہ پیش کرتا جاتا۔ اگر ممکن ہوتا تو اپنی زندگی کی ساری خوشیاں اُس کے قدموں پر ڈھیر کر دیتا...... اگر ہوش میں رہتا تو اُسے اپنے کندھوں پر بٹھا کر ہاسٹل تک پہنچا آتا۔ شاہدہ میرے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوشی لے کر آئی لیکن میں مفلس اُسے دعاؤں کے سوا کچھ نہ دے سکا......

باہر جانے کے لیے دو جگہیں میسر ہیں۔ ایک تو شہر میں میرے کزن والا فلیٹ خالی ہے اور دوسرے ٹھوکر نیاز بیگ میں 'لیزا سینما'۔ اُس جانب کوئی آتا جاتا بھی نہیں۔ سینما کے مالک شاہ جی اپنے یار ہیں۔ اپنا کمرۂ خاص عطا کریں گے۔ فلم بھی دیکھتے رہیں گے اور ساتھ ساتھ گپ شپ بھی چلے گی۔

یوں کرنا، تم ایک بجے وحدت روڈ والے موڑ پر پہنچ جانا۔ میں رکشہ لے کر آؤں گا۔ پھر وہاں سے جدھر بھی جانا ہوا چلے جائیں گے۔ میری جان! میں پیدل چلا کرتا ہوں۔ اور حد ہو تو رکشہ پر۔ میرے ساتھ چلو گی تو تمھیں بھی یہی ٹھوکریں کھانا ہوں گی۔ چلنے سے پہلے ایک بار پھر سوچ لینا......

رات کے تین بج چکے ہیں، لیکن نیند ہے کہ آنے سے گریزپا۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پرسوں کا سورج کہیں تین صدیوں بعد طلوع ہوگا۔ خدا جانے ان تین صدیوں میں کیا کچھ ہو جائے؟ کوئی زلزلہ آجائے، کوئی حادثہ پیش آجائے، کوئی سیارہ زمین سے آن ٹکرائے۔ کوئی بیماری، ناچاری آن دبوچے۔ مجھے ہر وہم سے خوف آرہا ہے۔ ہر اُس خیال سے جو مجھے پرسوں کے دن

سے محروم کرسکتا ہو۔ ہاں جب پرسوں آئے گی، تم میرے قریب ہوگی، میرے ہونٹ تمھارے لبوں پر پیوست ہوں گے، اُس لمحے قیامت بھی آجائے تو کم ہے۔ پھر یہ کائنات رہے نہ رہے۔ مجھے اِس کی پرواہ نہ ہوگی۔ لیکن پرسوں تک مجھے یہ کائنات اِسی حالت میں چاہیے......صرف پرسوں تک!

تمھارا پجاری

۱۹/اکتوبر۲ ۱۹۷ء
۱۲۹۔سرسید ہال
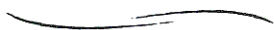
جان جی

باہر کی دنیا مستیوں کی انتہا پر ہے۔ قہقہے برساتے بادلوں کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو پھوٹ رہے ہیں۔ یوں لگ رہا ہے، جیسے میرے وجود سے اُبلتے نغموں نے ساری فضا پر اجنبی سا سحر بکھیر دیا ہو۔ کائنات میرے خوشی سے دھڑکتے دل کے ساز پر کھلکھلاتی ہوئی رقصاں ہے۔ دیواریں جھوم اُٹھی ہیں۔ زمین میرے اردگرد گھومنا شروع ہوگئی ہے، سورج نے غروب ہونے سے انکار کردیا ہے۔ سمندر اپنا سکون کھو چکے ہیں اور خدا زمین پر آ بیٹھا ہے، ساری دنیا رشک بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ جیسے معنی خیز انداز میں کچھ پوچھ رہی ہو...... بہت خوش ہوں اتنا کہ اپنے آپ کو سنبھالنا بھی دوبھر ہوا جاتا ہے۔ خوشیاں دینے والے نے کب سوچا ہوگا کہ ہم ایسے لوگوں سے اتنا کچھ برداشت ہو بھی پائے گا یا نہیں؟

یاد رکھئے آج اکتوبر کی 19 تاریخ ہے۔ کوئی بڑا ہی شُبھ دن۔ آپ نے پہلی بار مجھے سینے سے لگایا ہے۔ جبھی ہر جانب شادیانے بج رہے ہیں۔ میں نے تو جاگتے میں ایک خواب دیکھا تھا۔ دھندلا سا خواب۔ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اِس کی تعبیر اتنی خوب صورت ہوگی۔ لوگ تو دیوانے ہیں، افسانے لکھتے ہیں...... جھوٹ کے بدصورت پلندے۔ میرے پاس آئیں تو انھیں بتاؤں کہ حقیقت اُن کے سارے قصوں سے زیادہ حسین ہے۔ کوئی نئے الفاظ لائیں اور نئے معنی ورنہ اُن کی گھسی پٹی روایتوں میں حقیقت کا بوجھ سہارنے کی سکت نہیں......

میں لوگوں سے ذرا مختلف ہوں۔ لوگ خدا کو مانتے ہیں، میں اُسے ڈھونڈتا ہوں۔ بہت پہلے بچپن میں میرا خیال تھا، وہ میرے باپ ایسی شکل کا آدمی ہوگا۔ اُس کی طرح سخت اور غلط کام پر سزا دینے والا۔ اُس کی مونچھیں ہوں گی، اور کبھی کبھار نائی سے ڈاڑھی بھی بنواتا ہوگا۔ دُور

آسمانوں میں کرسی پر بیٹھا اس بات کا منتظر ہے کہ کب میں مروں اور وہ مجھے سزا دے۔ زمانہ ذرا آگے بڑھا تو ذہن میں کئی زلزلے آئے۔ ایک دنیا اُجڑی ایک آباد ہوئی۔ میں نے ننگ وافلاس اور ذلتوں کے ہمالہ تلے دبے انسان کو دُکھوں کے آلاؤ میں دہکتے دیکھا۔ کھیتوں کی سوندھی سوندھی خوشبو میں چلتی پھرتی انسانی لاشوں کے مناظر میرے احول کا اثاثہ تھے۔ جھکی کمریں، کھردرے ہاتھ، اردگرد پھیلی ناکامیاں۔ اُس وقت میں نے پہلی بار سوچا، خدا میرے باپ کی طرح بے بس اور اتنا نادار نہیں ہوسکتا اس کی شکل کسی اور سے ملتی ہوگی......

...... پھر میں اپنے گاؤں کے سکول پہنچا جو آج بھی عمارت ایسی کسی شے سے بے نیاز ہے۔ برکد کے بوڑھے درخت تلے گھر سے لائی ہوئی بوریوں پر ہم بیٹھتے۔ بے چارہ اُستاد کرسی کی بجائے ایک پرانے تنے پر اپنے تخت جماتا۔ اِسی درخت کی کسی شاخ سے 'مولا بخش' بناتا، جس سے ہم لوگوں کی 'ٹھکائی' ہوا کرتی۔ بوڑھا اُستاد کہا کرتا تھا۔ چار کتابیں عرش سے اُتری ہیں اور پانچویں یہ 'مولا بخش'۔ ہمیں اُس وقت چار کتابوں کا پتہ تھا، نہ کوئی غرض، ہمارے سامنے تو صرف پانچویں شے یعنی 'مولا بخش' ہی تلخ حقیقت تھا۔ مگر بوڑھے اُستاد کی 'چار کتابوں' اور 'مولا بخش' کے عمل سے گزرنے والے شاگردوں میں سے کوئی پانچویں جماعت سے آگے نہ جایا کرتا تھا۔ اُسی زمانے میں میرے بڑے بھائی کراچی سے ولایت چلے گئے۔ یوں ہمارے حالات نے ذرا سی انگڑائی لی۔ ایک عرصہ بعد جب میں کالج پہنچا تو صدیوں سے آباد اپنے گاؤں کا پہلا فرد تھا، جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے شہر پہنچا تھا۔ شہر کی دنیا نئی دنیا تھی۔ ایک جانب موٹریں، کاریں اور کوٹھیاں تھیں اور دوسری جانب بکتے جسم، زرد چہرے اور قبروں سے جھانکتی آنکھیں......اُس زمانے میں مجھے یقین ہوگیا کہ خلا کے اندھیروں میں کوئی اُجالا نہیں......ورنہ یہ سب کچھ کیوں ہوتا؟ زندگی میں پہلی بار جب میں نے آسمان کی کوکھ سے برف کو جنم لیتے دیکھا تو لمحہ بھر کے لیے مجھے یوں لگا جیسے میرے وجود میں سے کوئی اجنبی شے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ یہ فطرت کا لازوال حسن تھا...... یہ لمحہ اتنا گہرا تھا کہ میرا جی خدا پر ایمان لانے کو چاہا۔ میں نے سوچا، شاید خدا حسن کا نام ہے۔ یہ ۱۹۶۸ء کا واقعہ ہے۔ جب ہم کالج کے ایک ٹرپ پر کاغان گئے ہوئے تھے۔ دوسری بار......میں نے کوہِ طور کو اپنے اندر اُترتے محسوس کیا۔ تو پل بھر یوں لگا جیسے کوئی اجنبی قوت میرے جسم کے

سارے بند توڑ کر میری رُوح کے اندر گھسنا چاہتی ہے۔ اُس وقت تم نیم وا آنکھوں کے ساتھ میرے سینے سے چمٹی تھی۔ تمھاری اُکھڑی اُکھڑی گرم ریشمی سانس میرے حلق سے نیچے اُتر رہی تھی۔ میرے جلتے ہونٹوں پر تمھارے رسیلے ہونٹ پیوست تھے۔ میں الفاظ کی دنیا سے بہت دُور، بہت پرے پہنچ چکا تھا۔ جہاں زمین کی گردش سے بکھرتا ترنم...... خاموش آوازیں...... بے آواز موسیقی...... چپ کے ساز...... اَن گائے گیت اور الفاظ کے بغیر نغمے تھے۔ میں نے سورج کو بار بار اپنے خون میں ڈوبتے محسوس کیا۔ اِس تپش سے میں جل اُٹھا، مگر یہ آگ اتنی لذیز تھی...... کچھ مت پوچھئے۔

اُس لمحے میں نے خود کو مکمل پایا...... اور سوچا میں بھی کتنا دیوانہ ہوں۔ صدیوں سے جس حقیقت کو آسمانوں میں ڈھونڈھتا پھرا...... وہ تو خود میرے اندر موجزن تھی۔

آج میں نے تم سے کہا تھا کہ تمھیں اپنے متعلق تفصیل سے بتاؤں گا۔ روایتاً مجھے صرف اتنا سا جھوٹ بول دینا چاہیے تھا کہ تم سے پہلے مجھے کوئی عورت اچھی ہی نہ لگی...... اور میں ایک 'فرشتہ' ہوں میرا خیال ہے میں خود کو انسان سمجھتا ہوں...... فرشتوں سے میرا کوئی تعلق نہیں۔

تو سنو...... پہلی لڑکی میری زندگی میں اُس وقت داخل ہوئی جب مجھے اپنے مرد ہونے کا احساس نہ تھا۔ میں اور وہ کھیتوں میں الہڑ بچھڑوں کی طرح بھاگا کرتے۔ مستقبل سے بے خبر، کمسن نادان، محبت اور نفرت دونوں سے ناواقف...... اُس کا نام ارشاد تھا۔ لڑکی کا یہ مردانہ سا نام سن کر تمھیں ہنسی تو آئی ہوگی۔ پر گاؤں کے لوگ ناموں میں اتنی گڑ بڑ ضرور کر جایا کرتے ہیں۔ نام رکھنے والی بوڑھیاں، ایسا نام رکھنے کی کوشش کرتی ہیں جس کو وہ خود آسانی سے ادا کر سکیں...... اور بس، لمبے فساد کو کون جاتا ہے۔

ارشاد مجھ سے بڑی تھی...... اور یوں بھی لڑکیاں ساونی کی فصل کی طرح بہت جلد بڑھ جاتی ہیں۔ اُس وقت میں قریبی قصبے کے سکول میں غالباً ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ گاؤں میں پہلے تو کوئی پڑھتا ہی نہیں اور جو سکول تک پہنچ گیا وہ شہر میں پڑھنے والوں سے مختلف ہوتا۔ سکول سے گھر پہنچے تو مشقت کے کولہو میں جتے ماں باپ کے ساتھ مل کر کام میں لگ گئے۔ ایک دن سکول سے واپسی کے بعد معمول کے مطابق مجھے چارہ کاٹنے جانا تھا۔ برسات کا موسم، شدید حبس اور گھٹن

کا عالم، پورا گاؤں باجرے اور مکئی میں ڈوبا تھا۔ میں درانتی لیے گاؤں سے کوئی دو فرلانگ دُور اپنے قد سے تین گنا اُونچی مکئی میں گم، تازہ گھاس نکالنے میں مصروف تھا۔ اس موسم میں کھیت میں گھسنا بڑا ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ مارے گرمی کے انگ انگ سے پسینہ اُبل اٹھتا ہے۔ فصل کے کنوارے پتے جسم کے جس حصے پر لگیں، کھال اُتر اُتر جاتی ہے۔ ایسی تیز خارش بھڑکتی ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔

دنیا سے بے خبر تیزی سے اپنے کام میں جتا تھا۔ اتنے میں ساتھ والے کھیت سے مانوس آواز آئی ''ماسی ذرا گھاس اُٹھوا جانا''۔ یہ ارشاد تھی۔ میں نے درانتی روکی اور زور سے کہا ''ماسی نہیں آئی۔ اس کا پتر ہے اور گھاس بالکل نہیں اُٹھوائے گا۔'' ارشاد جانتی تھی، میں ہر کام سے پہلے ''نہ'' ضرور کیا کرتا ہوں۔ اُس نے دوبارہ آواز دی ''آجا مجھے جلدی گھر جانا ہے، میرا بابو......'' گاؤں کی لڑکیوں کے لیے ''بابو'' کسی تصوراتی شہزادے سے کم نہیں ہوتا جیسے آپ کے یہاں لڑکیاں سی ایس پی افسروں کے خواب دیکھتے دیکھتے بوڑھی ہو جاتی ہیں پر باز نہیں آتیں۔

میں نے دوبارہ کہا ''میں تیرا نوکر نہیں، اتنا کاٹی جو خود اُٹھا بھی لیتی۔'' پودوں میں سرسراہٹ سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میری طرف آ رہی ہے۔ یقین کیجئے میں اُس لڑکی سے خاصا ڈرا کرتا تھا۔ بچپن میں کئی دفعہ اُس نے میرے کان جڑوں سے ہلائے تھے۔ اور مجھے ''نہ'' سے باقاعدہ توبہ کروائی تھی۔ اب تو وہ اچھے خاصے تیل پلائے بھنسے کی طرح تھی۔ دو گھڑے سر پر اور تیسرا بغل میں دبائے بھاگی پھرتی۔ گاؤں میں جب لڑکی تین گھڑے اُٹھائے یا اپنی پنڈلیوں کے زور سے ''پینگ'' کو دبا کر اُونچا ''ہلارہ'' دینے کی کوشش کرے تو سمجھ لیجئے مفلس کی بیٹی جوان ہو گئی...... بڑے لوگوں کی بیٹیاں جب جوان ہوتیں ہیں تو ''بے چاریوں'' کی نازک کمر اس بوجھ سے ہی جھک جاتی ہے۔ نظر کی عینکیں ناک پر، بغل میں کتابوں کا بنڈل اور ذہن میں نئے ماڈل کی کاریں ہارن بجاتی پھرتی ہیں۔

ارشاد نے آتے ہی کہا ''ٹھہر تجھے سیدھا کرتی ہوں۔ سکول کیا جاتا ہے خود کو بابو ہی سمجھ بیٹھا ہے۔'' اُس نے میرا بازو پکڑ کر اُلٹا گھمایا، اور گھسیٹتی ہوئی اپنی کھیت کی جانب لے گئی۔ میں بچہ تو نہ تھا، جو یوں مار کھا لیتا۔ بُرا لگا اور غصہ بھی آیا کہ وہ کیوں مجھے جانوروں کی طرح ہانک کر کام لینا

چاہتی ہے۔ میں نے احتجاجاً اُسے گالی دے دی۔ بغیر کچھ بولے وہ پلٹی اور تڑاخ سے مجھے ایک زور دار تھپڑ جڑ دیا۔ ایک دفعہ میرے ذہن میں آیا کہ درانتی اُس کے پیٹ میں گھسا دوں۔ لیکن اُسے مارنے کی بجائے میں نے درانتی پرے پھینک دی اور پورے زور سے رو دیا۔ شاید اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

وہ مجھے مارا کرتی تھی۔ پھر جانے کیوں چپ بھی کرایا کرتی تھی۔ یہ کھیل بچپن سے جاری تھا۔ مگر آج اُس نے چپ نہ کرایا بلکہ خود رو اُٹھی تھی۔ میں حیران ہو کر خاموش ہو گیا کہ اس لڑکی کو کیا ہو گیا ہے۔ اُس نے مجھے اپنے قریب کیا اور پھر پوری شدت سے مجھے اپنی چھاتی سے چمٹا لیا۔ پسینے کے باعث اُس کی قمیض بدن سے چپکی پڑی تھی۔ میں نے خود کو اُس کے گیلے بدن کے ساتھ چپکتا محسوس کیا۔ اُس دن پہلی دفعہ مجھے اپنے مرد ہونے کا احساس ہوا۔

میں میٹرک میں تھا تو اُس کی شادی ہوئی۔ میں نے سکول جانا چھوڑ دیا اور چارپائی پر لیٹے لیٹے مریض بن گیا۔ ایسے روگ لگا گئی کہ میری صحت پھر کبھی اچھی نہ ہو سکی۔ مجھے کہا کرتی تھی ''چل یہاں سے بھاگ چلیں۔'' میں مگر بھاگ نہ سکا۔ جانتی ہو کیوں؟ اُس کی ماں جوانی میں میرے چچا کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اُس کے باپ نے میرے چچا کو قتل کر دیا۔ تب سے ہمارے خاندانوں کے درمیان نفرت کا ایک دریا بہہ رہا تھا میں اسے وسیع کر سکا نہ اسے پاٹ ہی پایا۔ میری ماں نے کہا تھا ''تو کن راہوں پر چل نکلا ہے، مجھ میں تیری لاش پر رونے کی ہمت نہیں'' ......

اور میں لوٹ آیا مگر میرے چار سال گرد بن کر کتابوں میں جمع ہو گئے۔

چار سال بعد، ایک دن وہ مجھے ملی، اور کہنے لگی ''قسمت میں یہی لکھا تھا، اب مان بھی لو شہر جا کر بہت سارا پڑھو، کسی میم سے شادی کرنا، میں تمھارا سہرا خود باندھوں گی۔'' میں نے کتابوں کی گرد جھاڑی اور ایک عرصے بعد دوبارہ سکول کی چاردیواری میں داخل ہوا۔

تم حیران تو ہو گی مگر یہ حقیقت ہے کہ میرے اور ارشاد کے تعلقات انتہائی سادہ تھے۔ وہ رات کے اندھیروں میں دبے دبے، میرے پاس پہنچ جایا کرتی۔ میں سونے کے معاملے میں سخت واقع ہوا ہوں ایک بار آنکھ لگ گئی تو یوں جانوں لگ ہی گئی ...... بے شک توپیں دغتی رہیں، پھر اپنی آنکھ کبھی نہ کھلی۔ ارشاد میرے ساتھ لیٹ کر میرے سر میں اُنگلیاں پھیرنا شروع کر دیتی اور یوں

اکثر مجھے جگائے بغیر رات بھر میرے پاس رہتی۔ دوسرے دن اُس کا رومال مجھے اپنے بستر پر ملتا۔ یہ اُس کے آنے کی نشانی ہوتی تھی۔ میں اُس سے لڑتا ''بھلا یہ بھی کوئی طریقہ ہے، جگایا کیوں نہیں تھا؟'' وہ آہستہ سے کہتی ''میں نے سوچا تم تھکے ہوئے ہوگے پڑھتے ہونا۔''

اُس کے جسم سے مجھے ایک خاص قسم کی خوشبو آیا کرتی تھی۔ جسم کی خالصتاً اپنی خوشبو۔ میں اُس سے پوچھتا ''یہ عجیب سی خوشبو کیوں آتی ہے؟'' وہ کہتی ''تمھیں آتی ہوگی۔ مجھے تو بالکل نہیں آتی۔'' اُس زمانے میں میرا خیال تھا کہ یہ خوشبو کچھ کچھ حلوے کی طرح میٹھی سی ہے۔ ایک عرصے بعد پتہ چلا کہ اس خوشبو کا اصل منبع اُس کے پسینے سے شرابور بغل تھے۔

پھر زمانے نے آگے کی جانب جست بھری۔ اب میں کالج میں تھا۔ کالج کی دنیا نئے زمانے کی عکاس تھی۔ یہاں عورتیں مرد اکٹھے پڑھتے تھے۔ گورڈن کالج ملک کا بہترین تعلیمی ادارہ میرے آبائی ماحول سے بہت مختلف تھا۔ یہاں لوگ ارشاد کی طرح پیار کرنے کی بجائے ''فلرٹ'' کیا کرتے تھے۔ میرے لیے یہ نئی بات تھی کہ لوگ بیک وقت چار چار جگہ اُوپر نیچے چکر چلانے میں فخر محسوس کرتے۔ میں اجڈ دیہاتی پہلے تو خوف زدہ بھیڑ کی طرح دُور کھڑا رہا۔ بالآخر میں نے بھی دوسری بھیڑوں کے پیچھے چھلانگ لگادی۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟ یہ بھی عجیب لوگ تھے، کیچڑ میں نہا رہے تھے اور سمجھتے تھے اس طرح اُن کے جسم دھل جائیں گے۔ میں گنوار، کیچڑ میں اُترتے لمحے یہ جانتا تھا کہ کیچڑ میں نہانے سے گندگی کیسے دُور ہوسکتی ہے؟ لہٰذا کوئی خواہش کئے بغیر، ہجوم کے درمیان تھا، ضرورت کا رشتہ تھا، چلتا رہا۔

اِسی دوران ایک لڑکی میرے قریب جانے کیوں آگئی، حالانکہ میں اُس کی سہیلی کو پسند کرتا تھا۔ اُس کا نام عتیقہ تھا۔ سانولی سی مگر خاصی اچھی تھی۔ میں نے اُسے منع کرایا پر وہ نہ مانی۔ میں نے پیار سے سنبھال کر اُسے اُس کے خاوند کے حوالے کردیا۔ شادی کے ایک ماہ بعد غریب اپنے بنگالی خاوند سمیت یحییٰ خان کی لشکر کشی کا نوالہ بن گئی۔ اُس نے اپنی شادی پر ایک ریکارڈ مجھے بھیجا تھا۔

''تم نہ جانے کس جہاں میں کھو گئے''

ریکارڈ آج بھی میرے پاس پڑا ہوا ہے، مگر وہ بے چاری خود جانے کہاں کھوگئی! مجھے اُس سے پیار تھا نہ نفرت، صرف ہمدردی کہ وہ کیچڑ میں نہائے بغیر مرگئی۔ ایک تو بنگالن تھی دوسرے گناہ گار نہ

تھی۔شاید خدا بھی اُسے معاف نہ کرے!

کالج کے آخری سال میں ایک شوخ وشنگ سی لڑکی میرے خاصی قریب آگئی۔کیچڑ میں تیرنے کی ماہر تھی۔اُس کے سفید چہرے پر کیچڑ کی کئی تہیں لگی تھیں۔اُس نے ابتدائی ٹریننگ ایک شادی شدہ ملٹری آفیسر سے حاصل کی اور پھر اس میدان میں یکتا ہوگئی۔اُن دنوں ایک مشہور سٹوڈیو اونر کے بھتیجے کے ساتھ مصروف تھی۔یہ وہ زمانہ تھا کہ پیپلز پارٹی میدانِ جنگ میں تھی اور میں اپنے کالج میں بھٹو صاحب کا خاص آدمی سمجھا جاتا تھا۔یہ لڑکی اکثر سوشلزم کے خلاف بحث کرنے چلی آتی۔پھر جانے کیوں اُس نے محسوس کرانا شروع کر دیا کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے۔شاید اس غلط فہمی کا شکار تھی کہ پیپلز پارٹی کی حکومت بنی تو میں ضرور پنجاب کا گورنر لگ جاؤں گا۔(کھر صاحب کے متعلق بے چاری کی معلومات صفر تھیں) میرے معاملے میں دھوکا کھا رہی تھی، کل کتنا اندھیرا ہوگا۔ میں اُسے اکثر بتاتا۔وہ سمجھتی شاید میں خاکساری سے کام لے رہا ہوں...... آخر اُس نے مجھے دبوچ ہی لیا!

وہ میرے 'بہترین مستقبل' کا انتظار کر رہی تھی...... یا پھر حسبِ عادت فلرٹ کرنے میں مصروف تھی۔تاہم اُس نے جلدی محسوس کر لیا کہ وہ غلط جگہ پر آگئی ہے۔اُس پر 'دورے' پڑنے شروع ہوگئے۔پنڈولم کی طرح کبھی ایک کونے پر کبھی دوسرے پر۔ایک دفعہ اُس نے مجھے مری بلایا۔جوں ہی ہم باہر نکلے، ہمیں بارش نے آن لیا۔ہم ایک درخت کے نیچے چھپ کر کھڑے ہو گئے۔وہاں اُس نے مجھ سے چمٹ کر کہا تھا۔"مجھے کہیں لے چلو، ہمیشہ کے لیے میں اپنی ماں سے بہت تنگ ہوں۔" اُس کی آنکھوں سے بھی برسات اُمڈ آئی۔میں اُس کی بات کا مطلب سمجھتا تھا کہ مجھے کار پر بٹھا کر کسی شاندار سی کوٹھی میں لے چلو۔اُسے کہاں لے جاتا؟ میرے پاس اپنی غربت کے سوا کوئی شے نہ تھی اور غربت اُسے پسند نہ تھی۔یوں تو وہ بھی اپنی ہی طرح کی ایک فیملی سے آئی تھی مگر اُس کی آنکھوں میں سکے کھنکھنایا کرتے تھے۔

ایک بار ہم فلم پر گئے۔فلم میں ہیروئن کی زبردستی شادی ہو رہی تھی۔وہ مجھ سے لپٹ کر چھم چھم رونے لگی یعنی وہ مجھ سے پیار تو بہت کرتی ہے...... پر یہ ظالم سماج اُس کی آرزوؤں کا قاتل بن جائے گا...... وہ کتنی مجبور ہے! میں فلمی ہیرو تو نہ تھا جو "ولن" کو فوراً قتل کر دیتا۔بڑی ہی

انکساری سے میں نے اُس کے کان میں کہا ''محترمہ جب آپ کی شادی ہوگی تو یقین کیجئے آپ کو اِس لمحے آج کا یہ رونا دھونا یاد تک نہ ہوگا'' اُس نے غصے میں آکر رونا بند کر دیا اور ذرا پرے ہٹ کر بیٹھ گئی۔

مجھے اُس کی باتیں یاد آتی ہیں، تو اکثر ہنسی آجاتی ہے۔ جب وہ مجھے اپنے ''عشق'' کا رو رو کر یقین دلایا کرتی تھی۔ میں نے کبھی اُس کے ماضی کا ذکر نہیں چھیڑا۔ مگر وہ ہر وقت اپنی ''پاک بازی'' کی قسمیں کھاتے نہ تھکتی تھی۔ اس پر مجھے گاؤں کی بڑی بوڑھیوں کی وہ کہاوت یاد آرہی ہے ''بالوں والی عورت اور بغیر بالوں کے مرد دونوں ہی بے وفا ہوتے ہیں۔'' بالوں کے لحاظ سے تو ہم دونوں ہی خاصے بے وفا تھے!

اُسے چاند کے حسن سے بڑا پیار تھا۔ ایک شام بہت ہی رُومانی موڈ میں کہنے لگی۔

''چاند کو دیکھ کر تمھیں کچھ ہوتا ہے؟'' میں نے کہا ''ہاں ہوتا ہے، لوگوں کے دلوں کی طرح بدصورت ہے۔ سورج کی دی ہوئی روشنی سے چمکتا ہے۔ مگر چکر زمین کے اردگرد لگاتا ہے۔ ہمارے بہت سے دوستوں کی طرح اس کی ٹانگیں ہیں، نہ سر۔ کتنا مجبور ہے۔ زمین بن سکتا ہے اور نہ سورج، دونوں کو فلرٹ کرتا ہے...... بے چارہ'' وہ بُرا مان گئی کہ میں اُس پر طنز کر رہا ہوں حالانکہ میں تو چاند کے متعلق بات کر رہا تھا۔

پھر......ایک دن اُس نے ایک نئی ڈاڑھی میں اُنگلیاں پھیرنا شروع کر دیں۔ مجھے اُس کا بدلتا چہرہ دیکھ کر کوئی حیرت نہ ہوئی۔ غریب اپنے باہر کو ڈھانپتے تھک چلی تھی مگر جب اندر باہر نکل آئے تو بھلا کیسے چھپے۔ جتنی بار وہ باہر کو ڈھانپتی تھی اندر اتنا ہی اور زیادہ ننگا ہو جاتا تھا۔ وہ عریانی کو ننگے لباس میں جکڑنے کی سعی ناکام کر رہی تھی۔ لیکن میری دعا ہے، اُسے اُس جہاں میں جنت ملے اور اِس جہاں میں کار، دونوں ہی کی اُسے بہت آرزو تھی...... جانتی ہو یہ لڑکی کون تھی؟ تمھاری سہیلی ناز......

میرا خیال ہے انسان کی عصمت جسم کے کسی خاص کونے میں نہیں ہوتی، بلکہ اس کا تعلق انسان کی پوری ذات سے ہے۔ مجھ سے بہت سی غلطیاں بھی ہوئی ہیں، مگر میں نے اپنی لمحاتی خوشیوں کی جستجو میں کسی کو کبھی اپنی بھوک کی آگ کا ایندھن نہیں بنایا۔ میں نے گناہ وثواب دونوں

ہی خلوص سے کیے ہیں۔ مگر گناہ کی معافی چاہتا ہوں نہ ثواب کا اجر مانگتا ہوں۔ میں نے پورے صدق دل سے اپنا ماضی تمھارے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے...... تاکہ کل تمھیں کوئی پریشانی ہو اور نہ مجھے شرمندگی۔

تم کہتی ہو تو یوں ہی سہی، ٹھیک ہے، سوائے شاہدہ ملک کے کسی کو بھی نہ بتایا جائے۔ وہ تو تمھارا سایہ ہے۔ اُس سے دُکھ دینے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ویسے بھی تمھیں میری جانب مائل کرنے کے لیے اُس نے بہت کوشش کی ہے۔ میرا ذاتی طور پر خیال تھا کہ کسی سے بھی کچھ نہ چھپایا جائے۔ جب ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ چند لمحے گزارنا ہی چاہتے ہیں تو لوگوں سے ڈر ڈر کر کیوں گزاریں۔ اگر دس بارہ دفعہ پیدا ہونا ہوتو پھر ایک دفعہ ڈر کر زندگی گزار لی جائے اور دوسری بار دل کی رہی حسرتیں پوری کر لی جائیں۔ صرف ایک ہی زندگی اور وہ بھی اتنے خوف تلے، کم از کم میرے لیے یہ پابندی نا قابلِ برداشت ہے۔

ٹھیک ہے ہم بہت دیر بعد ملے۔ اب کوئی اچھی سی توقع پیدا کر لینا حماقت ہوگی۔ مگر کسی کو اچھا سمجھنے کے لیے کوئی وقت معین تھوڑے ہی ہوتا ہے۔ کسی بھی لمحے پیار کیا جاسکتا ہے۔ کیا خبر مستقبل کے ساتھ کیا ہے؟ یہ کیا ہوا، ہفتے میں صرف ایک بار ملنے کی پابندی لگا رہی ہو؟ کم از کم ہفتے میں دو بار تو سجدہ کرنے کا موقعہ ملنا چاہیے۔ ایک بار تو ایسے ہی لگتا ہے جیسے لوگ جمعہ کے جمعہ نماز پڑھ لیتے ہیں...... باقی چھ دن کیسے گزریں گے؟ ذرا سوچیے، اور ہمارے 'کوٹے' میں ذرا سا اضافہ کر دیجیے۔ یعنی ہفتے میں دو بار ملاقات اور یونیورسٹی میں معمول سے کچھ زیادہ کمپنی اور بس۔

جب تم کہہ رہی تھیں ''نہیں ہفتے میں صرف ایک بار'' تو میں سوچ رہا تھا اپنے مقدر بھی کیا خوب واقع ہوئے ہیں۔ پہلے تمھارے ڈیڈی کی نگرانی میں مقید رہے۔ وہاں بھی ''سی کلاسیے'' تھے۔ وہاں سے رہائی ملی تو ہم نے خوشیاں منائیں۔ مگر سانس لیے بغیر سیدھے پھر قید میں پہنچ گئے۔ بیٹی کی قید میں! کچھ لوگ پیدا ہی قید کاٹنے کے لیے ہوتے ہیں۔ سو کاٹیں گے میری سرکار، اپنے ڈیڈی سے کبھی پوچھ لینا، قید کاٹنے کے معاملے میں ہم کیسے ہیں؟ نہ کام چوری، نہ فرار، نہ معافی نامہ، تم سے بھاگ نکلیں، ممکن ہی نہیں......

اگر تم بُرا نہ مناؤ تو پرسوں اتوار کے کچھ لمحے باہر کسی صحت افزا مقام پر گزارے جائیں۔ ٹھوکر

نیاز بیگ کی جانب چل نکلیں گے۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ یونیورسٹی یا شہر سے وہاں کوئی نہیں جاتا۔ یوں بھی کھلی جگہ ہے، شاہدہ کو ساتھ لیتی آنا، تم فلم دیکھنا اور میں تمھیں دیکھتا رہوں گا۔ مجھے پتہ ہے تمھارے ٹیسٹ شروع ہیں۔ چلو وعدہ ٹھہرا سائیکالوجی ہی چلے گی......نہ، نہ کیجیئے گا۔ یوں کرنا، ہاسٹل کے پیچھے والی سڑک پر کوئی ایک بجے پہنچ جانا میں رکشہ لیے منتظر رہوں گا۔ تم نے کہا تھا طویل سا خط لکھنا۔ میرا خیال ہے، اب تمھیں خاصا 'بور' کر لیا۔ رات ڈھل رہی ہے۔ میرے پاس ٹیپ ریکارڈ پڑا ہے۔ 'کمانڈر' سے لایا تھا۔

جانتی ہو کون سا گانا بج رہا ہے؟ ''چھپا لو دل میں یوں پیار میرا، کہ جیسے مندر میں لو دیئے کی''
مجھے پہلے بھی یہ ریکارڈ بہت پسند تھا۔ مگر آج ان الفاظ سے نئے معانی پھوٹتے محسوس ہو رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے سچ مچ تم گا رہی ہو صرف میرے لیے......موسیقی بھی کتنا خوب صورت دھوکا ہے!

تمھارا ہمیشہ

۱۰/نومبر۱۹۷۲ء
۱۲۹۔سرسید ہال

کنول

آج ہماری چھٹی ملاقات تھی لیکن جوں ہی تم باہر نکلیں، مجھے یوں لگا جیسے تم سے بچھڑے سال بیت گئے ہیں۔ پھر اسی کمرے میں تنہا بیٹھے، کتنی دیر تک اوٹ پٹانگ سوچتا رہا۔ مجھے تو معاملہ بگڑتا نظر آتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے طوفان نوح دل کے دروازے توڑ کر باہر آیا ہی چاہتا ہے اور ایک دفعہ باہر تک پہنچ گیا تو پھر ساری کائنات اس میں ڈوب کر رہ جائے گی۔ ایک آتش فشاں ہے، جو بس پھٹنے کو ہے۔

تم بہت خوبصورت ہو۔ یقین کرو اگر خوبصورت نہ ہوتیں، تب بھی میں تمھیں اتنا ہی چاہتا۔ حسن تو ایک اضافی اور بے معنی شے ہے۔ میری آنکھ میں ہے نہ تمھارے جسم میں، بلکہ ان دونوں کے درمیان پیدا ہونے والے رشتے کے احساس کا نام ہے۔ اور یہ رشتہ ایسا ہے کہ جب تم گزرتی ہو تو اس دھرتی اور آکاش کا جیسے دم تک جاتا ہے۔ زمانے کی وسعتیں تمھارے قدموں تلے سمٹ آتی ہیں۔ تم اپنی گہری آنکھوں سے جب دیکھتی ہو تو ساری دنیا نشے میں ڈوب جاتی ہے...... تم ہی بتاؤ اس میں میرا کیا قصور؟

تم نے کہا تھا "مستقبل کے متعلق ابھی بات نہیں کریں گے۔" ٹھیک ہے۔ بات نہ کرنا اور ہے مگر سوچنا...... اس سے قطعی علیحدہ شے ہے۔ اظہارِ بیان پر تو پابندی لگ سکتی ہے۔ مگر میرے ذہن پر بھی کوئی قفل لگا جاؤ، جو ہر لحہ تمھارے سوا کچھ سوچتا ہی نہیں۔ میں کیا کروں؟ تم ہی کچھ سوچو کوئی راستہ کوئی طریقہ کوئی حل...... کچھ کرو۔

پچھلے چند دنوں سے خوف کی ایک عجیب کیفیت مجھ پر ہر لحہ چھائی رہتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کوئی حادثہ ہونے والا ہے کوئی تکلیف دہ سانحہ۔ جب تم اپنا سر میری چھاتی پر رکھے، میرے دل

کی دھڑکنوں میں اُتر جاتی ہو۔ عین اُس لمحے بھی مجھے خوف رہتا ہے جیسے تم پھر کبھی نہ آؤ گی۔ جیسے یہ آخری ملاقات ہے، جیسے میں تمھیں کھو دوں گا۔ ہاں جب تمھاری آنکھوں میں جھانکتا ہوں تو مجھے ہر جانب اپنے لیے پیار ہی پیار نظر آتا ہے۔ اسی وقت پل بھر کے لیے یوں لگتا ہے کہ تم مجھے کبھی نہ چھوڑو گی۔ مگر پھر وہی اداسی اور خوف ذہن پر قبضہ جما لیتا ہے۔

یہی دیکھو نا۔ آج صبح تم خرم کے ایکسیڈنٹ کی وجہ سے کچھ پریشان سی تھیں۔ مگر میں تمھیں پھر بھی اپنے ساتھ مزنگ لے گیا۔ بعد میں مجھے اپنی خودغرضی پر پشیمانی بھی ہوئی آخر تمھارا اُس کا دو سال سے ساتھ ہے اتنی گہری وابستگی ہے۔ اُسے دکھ میں دیکھ کر تمھیں خوشی کیسے ہو سکتی ہے؟ مجھے معاف کر دینا، میں تمھارے معاملے میں ذرا سا خودغرض ہو جاتا ہوں۔ کم بخت دل یہی چاہتا ہے کہ تم ہر وقت سامنے رہو۔ اس میں میرا بھی کیا قصور؟

یہ دل ایک ویران مندر تھا۔ جس میں صدیوں سے انتظار کے دیے روشن تھے۔ سنسان خاموشیوں اور اُجاڑ اداسیوں کا راج تھا۔ تم نے اس ویرانے میں قدم رکھا تو جیسے زندگی کے ناقوس بج اُٹھے۔ بہاروں نے اپنا دامن پھیلا دیا۔ محبتوں کی سوندھی سوندھی مہک ہر جانب پھیل گئی۔ اس ویرانے کو دائم آباد رکھنا کہ تمھارے بعد یہاں کون لوبان کی خوشبو بکھیرے گا...... اپنے وجود کے پھول نچھاور کرے گا...... پھر کون یہاں نیم وا آنکھوں سے دیوی بن کر بیٹھے گا......

رات بیت رہی ہے۔ ساری کائنات چپ کی چادر تانے خاموشی کے طوفان میں گم ہو چلی ہے۔ نیند کے خمار میں ڈوبی چاندنی ڈگمگاتے قدموں سے پھسل رہی ہے۔ شاید تم سو چکی ہو۔
اپنے ہاتھوں کو ایک بوسہ دے دینا، پہلی فرصت میں قرض اُتار دوں گا۔

تمھارا پجاری

۲دسمبر۱۹۷۲ء
۱۲۹۔سرسید ہال

میری زندگی

جانتی ہو زندگی کتنی عزیز شے ہے؟...... بالکل تمھاری طرح۔ مگر ظالم بے وفا بھی کس قدر ہے۔ کسی لمحے اچانک دامن جھٹک کر چل دیتی ہے۔ جانے کس جانب؟ پھر لوٹ کر نہیں آتی۔ اس کے باوجود انسان اس سے پیار کرتا ہے۔ بے وفا چیزوں کی پرستش، انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ اس میں مجھ اکیلے ہی کا کیا قصور؟

یہ زندگی اور موت کا سلسلہ بھی عجیب ہے۔ کسی زمانے میں مجھے یقین تھا کہ موت کا اَن دیکھا پرندہ، خدا کی مانند آکاش کے اندھیروں میں بستا ہے اور کسی انجانے لمحے بھوکے عقاب کی طرح زندگی کے اُجالے کو جھپٹ لے جاتا ہے۔ تب میں موت سے بہت ڈرا کرتا تھا۔ ایک عرصے بعد مجھے احساس ہوا کہ موت تو میرے اندر موجود ہے۔ میرے وجود کا ایک ایسا امکان، جس کے بغیر زندگی کا ہونا ممکن ہی نہیں۔ ہر آتی سانس میری زندگی بھی ہے اور موت بھی۔ یوں میں ہر لحہ مر بھی رہا ہوں اور زندہ بھی ہوں۔ ہر مرتا لمحہ نئے زندہ لمحے کو تخلیق کیے جاتا ہے۔ یہی زندگی کا زندہ پہلو ہے۔ تب موت سے میری دوستی ہوگئی کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے محتاج تھے مجبوری کی حد تک ناقابلِ جدا۔

پھر تمھاری یادوں کی کائنات سر پر رکھے، جب میں نے اپنی بیشتر سرد راتیں، نہر کے کنارے چلتے چلتے گزار دیں تو میں نے پہلی بار زندگی کو رینگ رینگ کر مرتے دیکھا۔ مجھے اپنے اندر ایک بہت وسیع مدفن نظر آیا۔ جہاں چند ٹوٹی پھوٹی قبریں، کچھ کتبے اور میری اَن گنت لاشیں بے گور و کفن بکھری پڑی تھیں اور میں ہر لمحے اپنی نئی لاش ہاتھوں میں لیے ماضی کی لاشوں کے ڈھیر بھٹک رہا تھا۔

روتی تنہائیوں کے ہجوم میں، اپنے بچھڑے 'آپ' کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے مجھے کئی باریوں لگا جیسے، تمھارے بغیر زندگی ایک طویل اور بے معنی موت ہے۔ لوگ تو پاگل ہیں، جو سمجھتے ہیں، موت کا کوئی وقت معین ہے اور انسان کسی خاص دن کسی خاص لمحے مرتا ہے۔ انھیں کوئی سمجھائے کہ بے چارہ انسان تو زندگی بھر مرتا رہتا ہے۔ جسے دنیا موت سمجھے بیٹھی ہے وہ تو ایک ایسا مقام ہے، جہاں انسان مرنا بند کر دیتا ہے۔ جہاں موت کو بھی موت آجاتی ہے۔ لوگ موت کے مرنے کا سوگ مناتے ہیں۔ مگر زندگی کے مرنے پر کوئی نوحہ نہیں پڑھتے۔ ہیں نہ دیوانے!!!!

آج صفدر آیا تھا۔ ہم دونوں ہاسٹل کے ''کھوکھے'' پر بیٹھے رات گئے تک تمھارے متعلق باتیں کرتے رہے۔ پوچھ رہا تھا، ہم نے کب اُس کے گھر آنا ہے۔ میں نے اُسے بتایا کہ ہفتے میں ایک دن ملتا ہے اور دنوں کے حساب سے بُدھ پڑتا ہے۔ پھر پوچھنے لگا۔ ''تم اُس سے بہت پیار کرتے ہو؟'' میں نے کہا ''ہاں بہت، اتنا کہ میں خود بھی حیران ہوں۔ بس یوں سمجھ لو، انسان سے لے کر خدا تک جتنے رشتے ہیں، انھیں دوبار جمع کر لو تو میرا پیار اُن سے کچھ زیادہ ہی ہوگا۔'' صفدر کہنے لگا ''میں بھی مسرت سے بہت پیار کرتا ہوں۔'' میں نے پوچھا ''جب اُسے ملتے ہو تو سب سے پہلے کیا کرتے ہو؟'' صفدر نے بتایا۔ ''اُس کی آنکھیں چومتا ہوں، پھر ہونٹ اور پھر......'' میں ہنس پڑا اور کہا ''ہار گئے صفدر۔ میں تو سب سے پہلے اُس کے پاؤں چومتا ہوں۔'' وہ حیران سا ہو کر میری جانب دیکھنے لگا جیسے میری بات کا اُسے یقین نہ آ رہا ہو۔ میں نے کہا ''ہاں صفدر ٹھیک ہے۔ پیار تو ہم دونوں ہی کرتے ہیں بس تھوڑا سا فرق ہے۔ تم کسی کے دیوتا ہو اور میں پجاری۔ تم جیت چکے اور میں......''

صفدر کیا جانے، جب تم چلتے چلتے رک جاتی ہو تو کائنات کی دھڑکنیں تھم جاتی ہیں۔ آبشاروں سے پھوٹتے گیت اور جھرنوں کا مُدھر مُدھر الاپ تمھاری ہی مترنم مسکراہٹوں کی صدائے بازگشت ہے۔ تم کبھی اس زمین کے پیٹ پر ٹھوکر مار دو تو یہ غریب بھی میری ہی طرح خلاؤں میں بھٹکتی پھرے۔

ایک زمانہ تھا کسی کے منہ سے ایسی باتیں سن کر ہنسی آجایا کرتی تھی۔ میرا خیال تھا یہ باتیں محض استعارے ہیں، جن کا زندگی کی حقیقتوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ میں سمجھتا تھا حقیقت

کے لیے ایک سی ہوتی ہے مگر اب مجھے احساس ہوا کہ ہر فرد کی کائنات اُس کی ذات کے تہ خانے سے اُبھرتی ہے۔ بہت ممکن ہے میری کائنات کسی دوسرے کی دنیا سے مختلف ہو۔ شاید سب سے بڑی حقیقت یہی ہے کہ حقیقت ایک سی نہیں ہوتی۔ ورنہ ساری دنیا کے مرد ایک ہی عورت سے پیار کیوں نہیں کرتے؟ اور پیار تو دو انسانوں کے درمیان باہمی رشتوں کا بہتا دریا ہے۔ ذرا سوچو تو، جب ہم پہلی بار ملے تھے ہمارا تعلق خاطر کتنا مختصر سا تھا آج بات کہاں تک جا پہنچی ہے؟ میں نے ہر گزرتے لمحے تمھیں پہلے سے زیادہ قریب پایا ہے اور تم نے مجھے۔

اور پھر حقیقت تنہا نہیں ہوا کرتی۔ یہ بھی تو ایک حقیقت ہے کہ میں ایک چھوٹا انسان ہوں۔ ہم ایسے لوگوں سے مسرت کا ہر لمحہ چھین لینا اِس دنیا کی بہت پرانی ریت ہے۔ اِس رسمِ دنیا کو بدلنا بھی تو حقیقت ہے۔

اور یہ ''بڑے لوگ''!! انھیں کیا خبر، پیار کیا ہے؟ ان کے سینوں میں سنگِ مرمر کے اہرام بنے ہیں۔ ان کے لیے عورت، ربڑ کی بے جان گڑیا ہے جسے وہ کار کی فرنٹ سیٹ پر لٹکاتے ہیں یا پھر وہ ڈرائنگ روم میں سجا نیا صوفہ ہے۔ عورت کے گوشت کو نمک مرچ لگا کر کھاتے ہیں۔ شراب میں سوڈے کی جگہ حل کر کے پیتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسری بوتل، نئے سے نیا گوشت، اُچھوتا صوفہ...... مگر تم عورتیں بھی تو عیسیٰ کی بھیڑیں ہو۔ آنکھیں بند کیے بیٹھی ہو، جانے تمھیں کاروں کے اندر لٹکنے سے کیا ملتا ہے؟ جسے دیکھو وہ انسان کی بجائے بے جان گڑیا، بننے کی آرزومند ہے۔

ہوسکتا ہے، تمھیں ہم مرد جانوروں نے ذہنی طور پر مفلوج بنا رکھا ہو مگر تم میں کوئی ایک بھی ایسی نہیں جو اس جبر کے خلاف میدان میں آئے؟ کوئی ایسی نہیں جو بوتل بننے کی بجائے انسان بننا پسند کرے؟ کوئی ایسی جو کار کی بجائے اپنی ٹانگوں پر چلنے کے لیے تیار ہو۔

دوسری جانب ہمارے 'دانشور' حضرات ہیں جو الفاظ کے انبار تلے دبے بمشکل سانس کھینچ رہے ہیں۔ ان کی حالت سماج کے مندر میں روایات کے مقناطیسوں کے درمیان ہوا میں معلق بتوں کی سی ہے۔ سومنات کی یہ نشانیاں تمھیں دانش گاہ کے ہر کونے میں معلق نظر آئیں گی۔ رسل نے ایک مرتبہ کہا تھا ''جب کسی دانش گاہ کے کونے میں مجھے کوئی نوجوان جوڑا نظر آتا ہے تو مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ ان کی زندگی کا سب سے زیادہ حسین وقت ہے۔''

بے چارہ بوڑھا فلسفی! اور بہت سی باتوں کی طرح پیار کی دنیا کو بھی نہ سمجھ سکا۔ سچ پوچھو تو وہ خود بھی ایک بت تھا۔ ذرا سا غیر متوازن بت۔ پوری عمر اُسے آرزو ہی رہی، کہ کوئی عورت اُس سے پیار کرے۔ مگر سوائے اپنی بیوی کے کسی عورت کا گداز سایہ اُس کے جسم پر نہ پڑا۔ کوئی اُسے قبر کی آغوش سے کھینچ کر واپس لائے تو میں اُسے بتاؤں، کہ 'دانشوروں' کی بیمار جوانی کے جن زرد لمحات کو وہ امر کہتا پھرا، اُن کی حقیقت کیا ہے؟ دُور کسی کونے میں بیٹھی ہوئی یہ عجیب جنس زندگی کو خشک تصورات کے بوجھ تلے دبانے کی جستجو میں اپاہج ہوئی جاتی ہے۔ بتوں کی یہ حسین وادی نامرد اور ناعورت مجسموں کا عجائب گھر ہے۔ ان میں سے ہر بت اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ دنیا بال کھولے اُس کے ایک اشارے کی منتظر بیٹھی ہے۔ عشق ومحبت کی وادیاں اُسی کے دم قدم سے آباد ہیں۔ بے چارے لوگ! مجھے ان سب سے نفرت ہے۔ ان شاعروں نے بادشاہوں کی مدح میں قصیدے لکھ کر الفاظ کا چہرہ مسخ کر دیا ہے۔ ادیبوں نے جھوٹے افسانے تراش کر، معانی کی دنیا ویران کر دی ہے۔ ان کے الفاظ ومعنی کا تنگ قافیہ میرے جذبات واحساسات کا بوجھ سہار نے سے معذور ہے۔ عشق ومحبت کی بے جان روایتیں، میری محبت کا اظہار کرنے سے قاصر ہیں۔ اِن الفاظ کے درمیان میرے معانی نہیں سما پاتے انھیں ڈھونڈنا چاہو تو وہ تمھیں الفاظ سے آگے ملیں گے۔ شاید پھر تم محسوس کر سکو کہ میرا پیار بھی روایات سے مختلف ہے اور میری نفرت بھی۔ شاید تمھیں پتہ چل جائے کہ میں ان تپتے صحراؤں میں آسمان کی جانب سر کیے صنوبر کے تنہا درخت کی مانند کھڑا ہوں۔ مجھے اپنے دل کی دھڑکنوں میں انجانی آہٹیں سنائی دیتی ہیں۔ کسی نئے زمانے، نئے دور کی اجنبی آوازیں، نئی محبتوں کے گیت...... شاید تمھیں ان کا بھی کوئی سراغ مل پائے۔

لگتا ہے۔ شاہدہ سے کچھ کھٹ پٹ ہوگئی ہے، اُس کے بغیر اکیلے اکیلے تم کچھ آدھی سی لگتی ہو۔ میں نے آج پوچھا بھی مگر تم ہنس کر ٹال گئیں۔ بھلا اتنے اچھے لوگوں سے بھی کوئی ناراض ہوا کرتا ہے؟

ہاں سنو، پرسوں شام میٹنگ پر تم ضرور آنا۔ بنگلہ دیش والے مسئلے پر بحث ہوگی۔ مجھے پتہ ہے تم پکی 'بنگلہ دیشن' ہو۔ ارے بھائی لوگو، میں بنگالیوں کا دشمن کیسے ہو سکتا ہوں؟ بلکہ [illegible] ہے کہ ہم ''جماعتیوں'' کو دبوچیں مگر مصیبت یہ ہے کہ تم سارے لوگ مجھ پر انتہا پسندی کا [illegible] لگا

دو گے۔

دنیا میں، اس زندگی میں الغرض کارزار کائنات کے کسی گوشے میں انتہا نام کی کوئی شے نہیں ملتی۔ ہم جسے انتہا کہتے یا سمجھتے ہیں وہ دراصل کسی نئے موڑ کی ابتدا ہوتی ہے۔ میں نئے موڑ سے آواز لگا رہا ہوں، ناسمجھ اسے انتہا سے موسوم کر دیتے ہیں۔

پرسوں ملاقات ہے اور ہم ابھی سے تیار بیٹھے ہیں۔

پیار

۸/دسمبر ۱۹۷۲ء

۱۲۹۔ سرسید ہال
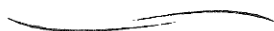
کنول

آج کا دن کتنا مبارک تھا کہ ہاسٹل میں بیٹھے بیٹھے ہی تمھارے درشن ہو گئے۔ تمھاری فوج کے سارے سپاہی تمھارے جلو میں تھے۔ صرف ایک شاہدہ نہ تھی شاید انجینئر کے چرنوں میں بیٹھی مستقبل کے حسین نقشے بنا رہی ہو گی۔ یونیورسٹی بند ہو تو ''بچہ لوگ'' یوں ہی کیا کرتے ہیں۔ یوں تو اشرف بہت کم گو اور سخت سا آدمی لگتا ہے مگر شاہدہ بھی آخر راجپوتنی ہے۔ پیار اور جنگ دونوں میں یکتا۔ بھلا! اُس سے کون جیت سکتا ہے؟

کوئی دس بجے کے قریب شجاع والے ہاسٹل میں گیا۔ وہاں سے تمھارا کمرہ صاف نظر آتا ہے۔ اُس وقت تم صبیحہ کے ساتھ ہاسٹل کے سامنے سائیکل چلانے میں لگی تھیں۔ پتہ ہے میں نے تمھیں دوربین سے دیکھا تھا۔ یہاں ایک لڑکے کے پاس بڑی نفیس دوربین ہے۔ جو ہمہ وقت کسی نہ کسی لڑکے کی آنکھ پر ہوتی ہے۔ چھٹی والے دن لڑکیاں نہاتی دھوتی ہیں، کپڑے بدلتی ہیں اور یار لوگ دوربین سے یہ کارروائی دیکھ کر اپنا 'دل پشوری' کرتے ہیں۔ اندازہ کرو کتنی طاقتور دوربین ہے مجھے تمھارے کمرے میں سامنے والے دروازے کی بائیں جانب بجلی کے بٹن سے ذرا اُوپر، کسی بچے کی تصویر صاف دکھائی دے رہی تھی۔ سٹڈی ٹیبل پر کتابیں سجی تھی، قریب ہی کسی عورت کی فریم لگی فوٹو تھی۔ غالباً تمھاری بڑی بہن کی، اور وہاں پھولوں کا ایک گل دستہ بھی گلاس میں لگا تھا۔ باہر بالکونی میں ٹیبل پر استری کھڑی تھی اور ساتھ ہی استری کیے ہوئے جوڑے ترتیب سے لگے تھے۔ کیوں تھا نا سب کچھ؟

تم سے پانچویں نمبر والے کمرے کی لڑکی کپڑے بدل رہی تھی۔ غریب کے پاس غالباً ایک ہی آزار بند ہے وہی اُس نے دوسری شلوار میں ڈالا۔ اتنی سوکھی لگ رہی تھی کپڑوں [illegible] ذر

بہتر لگتی ہے۔ مجھے تو کوئی خاص کشش محسوس نہ ہوئی۔ جانے لوگ کیوں ہر عورت کو ننگا دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ ننگا ہونا، ذرا سی نئی بات ضرور ہے مگر ایسی بھی نہیں کہ سانس ہی پھول جائے۔

میں نے دوربین دوسری منتظر آنکھوں کے حوالے کر دی۔ چنانچہ بہت سے حضرات نے اس منظر پر آہیں بھریں۔ ایک لڑکا بتا رہا تھا اُس نے تم لوگوں کے ہاسٹل میں کوئی ''نئی دنیا'' دریافت کر رکھی ہے۔ جہاں اُلٹی گنگا بہتی ہے۔ کوئی دو لڑکیاں ہیں، جن کے نام نہیں بتا رہا تھا۔ میرا خیال ہے، وہی جوڑی ہے جس کے متعلق تم نے بھی بتایا تھا۔ اب ذرا دیکھو ان دونوں کو پورا دن برقعہ لپیٹے یوں پھرتی ہیں جیسے بس ابھی ابھی حج سے لوٹی ہوں۔ اس سے تو بہتر ہے وہ کسی لڑکے سے ہی گپ لگا لیا کریں۔

شجاع والی ونگ میں تمھارے بہت سے نام لیوا بستے ہیں 'گٹیک' بھی اور تمھارا وہ ''سٹنٹ مین'' بھی جو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ہمیشہ تمھارا تعاقب کرتا رہتا ہے۔

خرم نے کب واپس جانا ہے؟ ویسے پوچھنا فضول ہی ہے کہ وہ جاتے کم اور آتے زیادہ ہیں۔ افسری بھی کیا نعمت ہے۔ ہر ہفتے دس دن کے سرکاری دورے پر لاہور آ جاتے ہیں اور جب دُور ہوں ہر شام بنام سرکار تمھیں 'ٹرنک کال' ہوتی ہے۔ بحیرۂ عرب کے دیبل والے ساحل سے ہم سا غریب تو سالوں نہ لوٹ سکے۔ میری جان فاصلے صرف غریب کے لیے ہوا کرتے ہیں۔ دولت تو زمین کی طنابیں کھینچ دیتی ہے۔ ہم تمھارے قریب رہ کر بھی دیکھنے کو ترستے ہیں اور وہ ساحل دیبل پر ہوتے ہوئے بھی کتنے قریب۔

میں نے خرم کو ابھی تک نہیں دیکھا۔ جب کبھی اُس کی کارگزرتی ہے میری آنکھیں......خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔ مجھے اُس سے رقابت تو ہوگی مگر اس کی نوعیت بہت عجیب سی ہے۔ لفظ رقیب سے وابستہ معانی شاید اس کیفیت کی ترجمانی نہ کر پائیں۔ مجھے اُس شخص سے بالکل نفرت نہیں ہوتی۔ میں نے کئی بار اکیلے لیٹے اپنے تخیل کے کینوس پر اُس کی تصویر اُتاری ہوگی۔ بہت خوبصورت سا خاکہ کھینچا ہوگا۔ آخر تمھاری قربت سے آشنا ہے کوئی ہم سا عام آدمی تھوڑے ہی ہوگا؟

میرے اندر کبھی ایک وحشی مرد ہوا کرتا تھا۔ روایتی رقابتوں کا قائل، بے معنی محبتوں کا

پرستار، بات بات پر مرنے مارنے کے لیے تیار۔ ایک شام میں نے اُس کے ہاتھ پاؤں باندھے اور اُسے ماضی کے دریا میں پھینک دیا۔ جبھی خرم سے میرا روایتی جھگڑا نہیں۔

مجھے اُس سے صرف یہ گلہ ہے کہ وہ مجھے تمھاری قربت سے محروم کر دیتا ہے۔ جب تک وہ یہاں رہتا ہے تنہائیاں سر پر بازو رکھے میرے اردگرد بین کرتی رہتی ہیں۔ ان دنوں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم ایک ایسی ماں ہو جس نے ایک بیٹا تو دنیا کے رواج کے مطابق جنم دیا۔ اُسے تم اُٹھائے اُٹھائے پھرتی ہو۔ اُس کے ماتھے پر سیاہ نشان لگاتی ہو کہ وہ نظر بد سے بچا رہے۔ لوگوں سے اُسے ملواتی ہو، گھنٹوں اُسے ساتھ لیے رہتی ہو۔ مگر مجھے ایک ایسا بچہ بنا دیتی ہو، جسے تم نے بن باپ کے پیدا کیا تھا۔ مجھے دنیا کے سامنے اپنا کہنے سے شرماتی ہو۔ اُس کی موجودگی میں تم مجھے روتا دھوتا چھوڑ کر چل دیتی ہو۔ پھر دنیا کی نظروں سے بچ بچا کر اندھیروں میں منہ لپیٹے پل دو پل کے لیے مجھے بہلانے کے لیے آجاتی ہو۔ خرم میرے وجود کو ناجائز بنا دیتا ہے۔

میں تم سے جتنا پیار کرتا ہوں، زمانہ اس کا بدل شاید کبھی پیدا نہ کر سکے۔ مگر میں نے کبھی تمھیں خرم کے ساتھ ملنے سے روکا اور نہ کبھی کہا کہ اُسے میری وجہ سے چھوڑ دو۔ میں تم سے پیار کرتا ہوں یہ میرا حق ہے۔ تم کسی کو پسند کرو، یہ تمھارا بنیادی حق ہے۔ خرم اُس قدیم دنیا کا باسی ہے جو صرف اپنا حق تسلیم کرتی ہے۔ جہاں دوسروں کو اپنی چھوٹی سی خواہشات پر قربان کر دینا ثواب سمجھا جاتا ہے۔ جہاں عورت کو ذاتی زمین کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ تو ابھی سے زمین کا مالک بنا بیٹھا ہے۔

میں جنسی آزادی سے خوف زدہ نہیں۔ لوگوں نے اِس لفظ کے ساتھ بہت سے غلط معنی وابستہ کر رکھے ہیں۔ پہلے تو وہ جنس اور پیار کو دو متضاد چیزیں سمجھتے ہیں۔ چنانچہ بغیر کسی باہمی پسندیدگی کے، فریضہ ازدواج کے نتیجے میں بچے پیدا کرتے رہتے ہیں۔ جنسی آزادی کا نام سنتے ہی اُن کے ذہن میں پہلا خیال یہ آتا ہے کہ شاید برہنہ عورتیں ہر چوراہے پر اُن کی منتظر ہوں گی۔ جہاں روپے پیسے دیئے بغیر کام چلے گا۔ انھیں بنیادوں پر لوگ جنسی آزادی کی حمایت بھی کرتے ہیں اور مخالفت بھی۔ میں ان دونوں سے متفق نہیں۔ ایسی سوچیں صرف جنسی اشتہا کی نمائندگی کرتی ہیں۔ میرے نزدیک دنیا میں کوئی ایسی آزادی ممکن نہیں جو غیر مشروط ہو۔ حتیٰ کہ صرف سوچنے کی

آزادی کے لیے بھی ذہن وشعور کا ہونا اوّلین شرط ہے۔ جنسی آزادی کے لیے باہمی پسندیدگی لازمی شرط ہے اوراس کے نتائج کی ذمہ داری دوسری شرط۔ (ہمارے ہاں جنس صرف نتائج سے وابستہ ہے، جبھی یہاں شدید گھٹن کا عالم ہے۔)

زندگی کے سمندر کا احاطہ ممکن نہیں۔ انسان اپنے زندہ لمحات کو زیادہ سے زیادہ حسین بنانے کا خواہش مند رہتا ہے۔ وہ زندگی کا دامن رنگ و بو سے بھر دینا چاہتا ہے۔ ذرا سوچو تو آج ۱۹۷۲ء ہے۔ آج سے صرف سو سال پہلے انہی جگہوں پر کوئی لوگ بستے ہوں گے۔ اُن کے بھی مسائل ہوئے ہوں گے۔ بہت سوں نے ایک دوسرے کو چاہا بھی ہوگا۔ ہماری طرح چھپ چھپ کر ملے بھی ہوں گے، آج تہِ خاک ہیں۔ کوئی نہیں جانتا وہ کون لوگ تھے؟ میں نے اکثر یونیورسٹی کے حسین برآمدوں میں بیٹھ کر اُن لوگوں کے متعلق سوچا ہے۔

یقین جانو، ۲۰۷۲ء بھی آئے گا۔ ٹھیک آج کے دن انہی جگہوں پر جانے کون لوگ کھڑے ہوں گے۔ ان کے بھی مسائل ہوں گے۔ باہمی پیار و محبت کے تذکرے ہوں گے اور ہمیں، ہم سب کو کوئی اُسی طرح نہ جانتا ہوگا جیسے آج ہم اگلوں سے وقف نہیں ہیں۔ اُس وقت ہم تہِ خاک ہوں گے۔ اگر انسانی زندگی کا حدود اربعہ صرف اتنا ہے تو تم ہی سوچو، پیار کے چند لمحات جو ہمیں میسر ہیں انھیں کیوں ضائع کریں؟ رُسوم کا زہر پی پی کر کیوں گلتے رہیں؟ اندھی روایتوں کے دائرے میں کیوں مقید رہیں؟ اور لوگوں سے کیوں ڈریں؟

میں اور تم اتنے مختصر ہونے کے باوجود اِس کائنات کی سب سے قدیم شے بھی ہیں۔ اَن گنت گزری صدیوں کی تہیں ہمارے اندر لگی ہیں اور آنے والی جانے کتنی صدیوں کی قوت ہمارے اندر مچل رہی ہے۔ جانے کتنے لوگ ہماری کمر میں رینگ رہے ہیں۔ ہم حیاتِ انسانی کے اِسی تسلسل کے امین ہیں۔ جبھی میں کہا کرتا ہوں ''ہم صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔'' اور سنو، اس ساتھ کے لیے ہم اپنے سوا کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں۔

میں غربت کی بادسموم میں گھرا، ایک عام آدمی ہوں۔ میری یہ خواہش نہیں کہ ۲۰۷۲ء میں بسنے والے میرا نام یاد رکھیں۔ یادیں اور نام تو بہلاوے ہوتے ہیں۔ میں اُن کے لیے کوئی بہلاوا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔ غربت وافلاس، خوف ودہشت اور محرومیوں کی بجائے میں اُن تک

صرف انسانی زندگی منتقل کرنا چاہتا ہوں۔ یہی وہ آدھی سچائی ہے، جس کی میں بات کیا کرتا ہوں۔ اُن نئے لوگوں کو اپنی روایات خود بنانی ہیں۔ پیار و محبت کی روایات، آزادی اور برابری کی روایات......

کہہ سکتی ہو میں خوابوں کی دنیا کا مکین ہوں۔ میری باتیں کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ پر کبھی تم نے بھیڑ کو ذبح ہوتے دیکھا ہے؟ اُس وقت اگر تمھیں کوئی بتائے کہ وہ تمھارے لیے شاندار جوتی بنا رہا ہے اور تم نے یہ جوتی پہلے کبھی نہ دیکھی ہو۔ تم کہو گی ''اس آدمی کا دماغ چل گیا ہے''...... اِسی طرح لوگ مجھے بھی دیوانہ کہہ دیتے ہیں۔

اگر ۲۰۷۲ء میں چند لمحوں کے لیے مجھے دوبارہ زندگی مل جائے تو میں اُن نئے لوگوں سے صرف ایک بات کہوں کہ بیسویں صدی انسان کے خلاف نفرتوں کی صدی تھی جہاں مرنا بھی دشوار تھا اور زندہ رہنا بھی۔ اور نفرتوں کا یہ عالم تھا کہ پیار بھی چھپ چھپ کر کرنا پڑتا تھا......

ہاں جی، آج شام تم نظر نہ آئیں۔ باہر نکلا تو ''صبیحہ سنتوش'' کی جوڑی، پُلی پر جمی تھی۔ حسب عادت انہوں نے چھیڑا بھی مگر میں سر جھکائے گزر گیا۔ تم اُن کے ساتھ نہ تھیں۔ اُن سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ انہوں نے سوچا ہوگا میں بیمار ہوں، یا پھر اُن سے ناراض، جبھی انہوں نے تم سے ''شکایت'' لگائی ہے۔ پگلی دنیا اپنے درد کو کیا جانے؟

شام ساڑھے آٹھ کے قریب تمھیں فون بھی کیا۔ تم نہ تھیں۔ کوئی لڑکی فون پر تھی۔ کافی دیر گپ لگاتی رہی۔ پوچھتی رہی کون ہو، کیا کرتے ہو، کیا شکل ہے، تمھارے ہاتھوں کی اُنگلیاں کیسی ہیں، قد کتنا ہے، رنگ کیسا ہے وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اُس سے پوچھا ''تم یہ سب کیوں جاننا چاہتی ہو؟'' کہنے لگی ''فون پر تمھاری آواز بڑی پیاری لگتی ہے۔''

میں نے اُسے کہا کہ اُس نے اگر شکل دیکھ لی تو پھر روتی پھرے گی۔ جب میں فون بند کرنے لگا تو اُس نے کہا، ''اگر تم بہت مصروف نہیں ہو تو چند منٹ اور باتیں کر لیتے ہیں......'' اور اپنا رنگ، ناک نقشہ بتانے لگ پڑی کہ وہ بہت ہی بدصورت ہے۔ اُس کی شکل حبشیوں جیسی ہے۔ بہت نالائق ہے اور اس قسم کے دوسرے مذاق کرتی رہی۔ میں نے بمشکل اُس سے جان چھڑائی۔

فون پر یہ لڑکیاں اتنا تنگ کرتی ہیں، خدا ہی بچائے۔ کئی دفعہ تو گھروں سے یہاں لڑکوں

کے ہاسٹل میں ٹیلی فون کرتی ہیں۔ جو بھی اُن کے ہاتھ لگ جائے اُسی کا دماغ چاٹنا شروع کر دیتی ہیں۔ لڑکے بھی یہی حرکت کرتے ہوں گے۔ جبھی ہمارے ہاسٹلوں کے ٹیلی فون ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں۔

عام زندگی پر پہرے ہیں۔ عورت اور مرد اپنی مرضی سے ایک دوسرے کے ساتھ مل نہیں سکتے۔ معاشرتی بندھنوں کی زنجیریں ہیں۔ ناروا پابندیاں ہیں۔ اخلاقی ضوابط ہیں۔ غیر انسانی بندشیں ہیں۔ بے چارے لوگ کہاں جائیں؟ کیا کریں؟ بس فون پر ہی گپ شپ لگا کر 'ایمان تازہ' کرتے ہیں اور جنھیں فون کی عیاشی میسر نہیں، وہ اپنے ذہن کے پردوں پر 'بلیو پرنٹ' چلاتے ہیں۔ آنکھیں بند کر کے خیالات کی دنیا بساتے ہیں اور اپنی اپنی پسند کے مردوں اور عورتوں کو اپنے پہلو کی زینت بناتے ہیں۔ اپنی مرضی کے مطابق اُن سے مکالمے ادا کراتے ہیں اور یوں فطری خواہشات کو پورا کرتے ہیں۔

اپنی سوسائٹی اُن باتوں پر شرمندہ ہو جاتی ہے جن پر نہیں ہونا چاہیے لیکن اُن باتوں پر قطعاً شرمندہ نہیں ہوتی جن پر اُسے شرمندہ ہونا چاہیے۔ مثلاً عورت اور مرد کا ملاپ فطری حقیقت ہے۔ اس حقیقت سے شرمانا ایک غیر فطری رویہ ہے۔ لیکن رشوت، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی اور دولت کے انبار بغیر شرمائے اکٹھے کیے جاتے ہیں۔ ان بُرائیوں پر کوئی شرمندہ نہیں ہوتا۔

میں مانتا ہوں، انسان کو اپنی پیدائش پر کوئی اختیار نہیں۔ وہ کسی معاشرے، کسی مذہب، کسی طبقے اور کسی بھی فرد کے ہاں جنم لینے پر مجبور ہے۔ وہ اپنی مرضی یا خواہش کے بغیر جنم لیتا ہے۔ ہم تم اِسی طرح مختلف لوگوں کے ہاں پیدا ہوئے۔ لیکن انسان کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے ماحول، اس کی اخلاقیات اور اس کی بندشوں کو قبول کرے یا پھر انھیں رد کر دے۔ یہ ضروری نہیں، میں وہی کچھ کروں، جو میرا معاشرہ کہتا ہے، یا کرتا ہے۔ میں اُسے ہی حقیقت سمجھوں جسے لوگ حقیقت سمجھتے ہیں۔ میں بھی اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لوں، کیونکہ یہی میرے ماحول کا دستور ہے۔ میں زندگی کی ہر حقیقت کو پرکھنا چاہتا ہوں، میں ان رُسوم روایات کو جانچنا چاہتا ہوں۔ ان کے مطالب معانی سمجھنا چاہتا ہوں۔ اور پھر انھیں قبول کروں یا رد کر دوں، یہ میرا اختیار ہے۔ یہی میری آزادی ہے۔ میں اندھے عقیدوں کا قائل ہو کر یہ آزادی کھونا نہیں چاہتا۔

جو لوگ دی ہوئی صورت حال کو من و عن قبول کر لیتے ہیں۔ جو لوگ حادثہ پیدائش کی بنا پر ہندو یا مسلمان ہوتے ہیں، وہ دراصل بڑے قابلِ رحم لوگ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر ہندو کے ہاں جنم لیں تو راشٹریہ سیوک سنگھی اور بدقسمتی سے واہگہ کی اِس جانب ہوں تو جماعت اسلامی والے کہلاتے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ وہ مسلمان کیوں ہیں اور نہیں سوچتے کہ وہ ہندو کس لیے ہیں۔ اگر حادثۂ پیدائش کا اتفاق اس سے اُلٹ ہوتا، تو باجپائی آج مولانا طفیل محمد ہوتا اور مولانا اتنے ہی کٹر ہندو......اور دونوں اسی شد و مد سے 'خدمت دین' میں مصروف ہوتے...... یہ سوچ بغیر کہ جو کچھ کر رہے ہیں، وہ صحیح ہے یا غلط۔

جو لوگ بندشوں کو صداقت جان کر ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں، وہ غیر فطری طریقوں سے فطرت کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی اندھی روایات کی تنگ قبروں میں اُتارنے کو خدائی خدمت سمجھتے ہیں۔ ایسے آدمی اندھیرے میں جو کچھ کرتے ہیں، روشنی میں اس پر تبرا بھیجتے ہیں۔ ان کی ذات کے کئی روپ ہوتے ہیں اور ہر روپ دوسرے کے برعکس ہوتا ہے......

وہ اپنی آدھی زندگی خود کو فریب دینے میں ضائع کر دیتے ہیں اور بقایا آدھی اس فریب کو صحیح ثابت کرنے کی سعی ناکام میں۔ خود فریبی کے سمندر میں ڈوبے اس قبیلے کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں دوسروں کے کندھوں پر سوار ہو کر جنت میں داخل ہونے کی بجائے اپنے قدموں پر چل کر دوزخ میں جانا پسند کروں گا۔

اس سماج میں اگر صداقتوں کو محسوس کرنا چاہو تو کسانوں کی کسی بستی میں چلی جاؤ۔ تمھیں یقین آ جائے گا کہ اُن کا اندر اور باہر ایک ہے۔ اُن کے عقیدے کتنے سادہ ہیں اور زندگی کے لیے اُن کی اپروچ زندگی سے کس قدر قریب ہے۔ اُن کا پیار کتنا براہِ راست ہے اور وہاں مرد اور عورت کا رشتہ فطرت کے کتنا قریب ہے۔

ہاں یاد آیا، تم نے فلاسفی آف ایجوکیشن پر نوٹس مانگے تھے۔ میں نے اپنے شعبۂ فلسفہ کے اساتذہ کو ٹٹولا ہے وہ سب بھی اپنی مانند اِس معاملے میں کورے، کنوارے اور معصوم ہیں۔ ہمارے یہاں یہ انتہائی اہم مضمون سرے سے پڑھایا ہی نہیں جاتا۔ ہے نا حیرت کی بات؟ لیکن ہم فلسفی

ہیں اور ہمارے اساتذہ ٹھہرے ہمارے بھی اُستاد۔ وہ ہمیں فلسفہ کے سوا ہر شے پڑھاتے ہیں اور ہم پڑھنے کے سوا سب کام کرتے ہیں۔ لہٰذا انتہائی سکون اور کمال ہم آہنگی سے یہ سلسلہ چل رہا ہے، اور جانے کب تک چلتا رہے گا۔ تاہم تم گھبراؤ نہیں، مجھے اِس مضمون پر چند کتابیں میسر آ گئیں ہیں، تمھیں بھیج دوں گا۔ کام چلا لینا۔

لکھتے لکھتے ہاتھ بھی تھک گیا ہے۔ اب اجازت دو۔ پیار...... پیار...... پیار

بہت سا پیار

۱۹/دسمبر ۱۹۷۲ء

۱۲۷۔ سرسید ہال

دیوی رانی

لو تم بھی کیا ضدی چیز ہو، ذرا سی بات پر رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیا۔ شاہدہ بھی بتا رہی تھی کہ تم رات بھر سسکیاں لیتی رہیں۔ تمھیں اپنی آنکھوں کی قسم اب بس بھی کر دو، بھول بھی چکو۔

میں نے فلرٹ کہا۔ مانتا ہوں نہیں کہنا چاہیے تھا اور میں اگر کسی غلط فہمی کا شکار ہو ہی گیا تھا تو پھر تم ہی نے ہمیشہ کی طرح حوصلے سے کام لیا ہوتا۔ تمھیں کیا ہو گیا تھا تکیہ منہ پر لیے پورے دو گھنٹے تم روتی رہیں۔ بار بار ایک ہی بات کہے جا رہی تھیں ''آپ مجھے چھوڑنا چاہتے ہیں'' اور میں وہ سارا وقت تمھیں چپ کراتے کراتے، خود بھی روہانسا ہو گیا۔ صفدر بے چارہ الگ پریشان ہوا۔ بلکہ آج تمھاری خبر لینے کیمپس بھی آیا۔ تم تو رو پیٹ کر اپنا بوجھ ہلکا کر رہی ہو اور ہم جنھیں رونے کی عادت نہیں، اِس حالت میں کیا سو بھی سکے ہوں گے؟

پگلی! میں تمھیں چھوڑ جاؤں گا؟ خود ہی سوچو یہ ممکن ہے؟ میں نے اپنی زندگی کی ساری آرزوئیں یکجا کر کے تمھارا بت بنایا ہے۔ آسمانوں سے زیادہ بلند اور ستاروں سے زیادہ حسین۔ اسے چھو کر اپنے وجود کو نئے معنی دیتا ہوں، اسے دیکھ کر اپنے حوصلوں کو جوڑتا ہوں اور جب اس بت پر کوئی خراش آ جاتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے نیچے سے زمین سرک گئی ہو، فضا میں تحلیل ہو گیا ہوں۔ تمھیں میری پرستشوں کی قسم اس بت پر خراش نہ آنے دیا کرو۔

میں ایسا شخص ہوں کہ بلا جواز دوسرا سانس کھینچنا بھی گوارا نہ کروں۔ میرے پاس یہ جواز تم سے پہلے بھی موجود تھا۔ مگر تم نے اس کی تکمیل کی ہے۔ تم میری ضرورت ہو، میں پھر سے ادھورا نہیں ہونا چاہتا۔

اور ہاں گالی میرے منہ سے نکل جایا کرتی ہے۔ بُرا نہ منایا کرو۔ یہ بیماری مجھے ورثے میں

ملی ہے اور پھر گالیوں کے معنی نہیں ڈھونڈا کرتے، یہ صرف سننے کے لیے ہوتی ہیں یا پھر ہوا میں تحلیل ہونے کے لیے۔

ویسے کچھ تو تمھاری بھی غلطی تھی۔ تم لوگوں کا جو بھی پروگرام تھا بتا دینا چاہیے تھا۔ جب ہم سبھی کھانا کھا رہے تھے تو تمھاری سہیلیوں اور خان کے درمیان اشارے چلے۔ میں نے سوچا ان لوگوں کا کوئی پروگرام ہوگا جو شاید میری وجہ سے گڑبڑ ہو رہا ہے۔

کھانے کے بعد جبھی میں وہاں سے اُٹھنا چاہتا تھا۔ تم نے پھر بٹھا لیا کہ 'بوٹنگ' کے لیے چلیں گے۔ ابھی چائے ختم نہ ہوئی تھی کہ تمھاری سہیلیاں جاسوسی فلموں کے کرداروں کی طرح اس لڑکے سمیت غائب ہوگئیں، ایک رہ گئی تھی وہ تمھیں لے کر چل دی۔

میں ابھی کیفے ٹیریا میں ہی تھا۔ اظہر اندر آیا اور دوسری میز پر بیٹھے اپنے ساتھی کو تم لوگوں کے متعلق بہت گندی سی کوئی بات بتانے لگا۔ میں نے اُسے قریب بلا کر منع کیا۔ تاہم مجھے بہت صدمہ ہوا۔ تم دن کے اُجالے میں میرے ساتھ پھرتے ہوئے گھبراتی ہو، حالانکہ خرم کے ساتھ پھرتے ہوئے تمھیں کوئی خوف نہیں آتا۔ رات کے اندھیروں میں ایک تیسرے لڑکے کے ساتھ درختوں کے درمیان چھپ چھپ کر 'کش' لگانے سے تمھاری عزت میں جیسے اضافہ ہوتا ہے۔ سارے خوف، ساری بدنامیاں، ساری پابندیاں کیا صرف میرے ہی لیے ہیں؟ تمھارے ساتھ پھرتا رہوں اور لوگوں کے سامنے تم سے اتنا بھی کہہ نا سکوں ''کل باہر جانا''۔ ہر شام خط لکھوں اور فرسٹ ائیر کے لڑکوں کی طرح کتابوں میں چھپا چھپا کر تمھیں دوں۔ ''صبیحہ کو پتہ نہ چلے''۔ ''خرم سے کوئی کہہ دے گا۔ اُسے شک پڑ گیا ہے''۔ ''گلشن کو نہ بتانا''۔ میرے لیے تم نے ہر قدم پر کئی خرم کھڑے کر رکھے ہیں۔ تمھاری خاطر اِس جھوٹے ماحول میں کتنا جبر کر کے جھوٹ بولتا ہوں۔ اگر میں کسی ایسی دنیا میں آ ہی گیا ہوں، جہاں لوگ میری طرح نہیں سوچتے تو اس میں میرا کیا گناہ کہ تم سبھی لوگ اپنے اپنے مقام پر مجھے سزا دینا کارِ ثواب جانتے ہو۔ میں نے تمھیں اچھا سمجھا ہے کوئی ڈاکہ تو نہیں ڈالا؟ رات بھر میں یہی کچھ سوچتا رہا پھر غصہ تو آنا تھا۔

مجھے پتہ ہے تمھارا اُس لڑکے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور جس کے ساتھ ہے میں نے تمھیں اس سے کبھی نہیں روکا۔ مجھے یہ بھی پتہ ہے تم لوگ شوقیہ طور پر چرس کا ذائقہ محسوس کرنا چاہتے تھے۔

مجھے کہتے تو میں لا دیتا۔ تم نے کون سا نشہ ہی لگا لینا تھا۔

ٹھیک ہے، میں آزادی کا قائل ہوں، مگر چرس پینا بھی کوئی آزادی ہے؟ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی زہر کھائے اور کہے میں بغاوت کر رہا ہوں۔ چرس کے دھوئیں سے کیا سماج کے جابرانہ رشتے ٹوٹ جائیں گے؟ بتاؤ نا، کیا تبدیلی آ جائے گی؟ چند لمحے ذہن کے پردوں پر زہر کے نشتر چلانے سے ہمارا ذہن ماؤف ہو سکتا ہے باہر کی دنیا نہیں۔ یہ تو ایسی ہی بات ہوئی جیسے بکری بھیڑیے کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے اور فرض کر لیتی ہے کہ ''بھیڑیا اب اُسے نہیں دیکھ سکتا''۔ میری جان، یہ بزدلی کی انتہا ہے۔

اس سرزمین کے لوگ صدیوں سے چرس پیتے آئے ہیں۔ دیکھ لو انھیں کتنی آزادی میسر ہے؟ جب میں کسی پرانی گلی کے کونے سے چرس کا دُھواں پھیلتے دیکھتا ہوں تو مجھے ان پر بہت رحم آتا ہے۔ جب بڑے لوگوں کے بچے اسے 'حشیش' کہہ کر پیتے ہیں تو مجھے ان سے نفرت آتی ہے۔ یہ لوگ چرس اس لیے پیتے ہیں کہ مغرب میں آج کا دستور یہی ہے۔ صاحب لوگ ہیں بُرائی بھی 'ولایت پلٹ' کرتے ہیں۔ چرس پینا ہی اپنے لوگوں سے سیکھ لیتے تو کوئی بات بھی تھی۔

'حشیش گروپ' دن بھر بغاوت اور آزادی کے نعرے لگاتا ہے اور حالت یہ ہے کہ اِدھر پٹاخے کی آواز آئی، اُدھر اُن کا نشہ ہرن ہوا۔ پھر کئی دن کمروں سے باہر نہیں نکلتے۔ اگر مجلوقیت اور خودلذتی کے مشترکہ مقابلے کا نام آزادی ہے تو پھر یہ لوگ بہت آزاد ہیں۔

چلو اب تم نے 'کش' لگا لیا۔ تمھیں محسوس ہوا ہوگا ندیاں جیسے دریا بن گئی ہیں، پتھر پھیل کر پہاڑ ہو گئے ہیں۔ ہر شے بہت نفیس ہو گئی ہے۔ اگر ٹھوکر لگ گئی تو ٹوٹ جائے گی۔ سمجھ لو پیار کا نشہ اس سے بھی شدید ہوتا ہے۔ مبتلائے ہوئے ذہن کو چھوٹی سی، معمولی سی اور بے ضرر سی باتیں بہت بڑی باتیں لگتی ہیں۔ جذبات و احساسات کانچ سے زیادہ نازک اور اس کے ٹُوٹے ریزوں سے زیادہ خطرناک ہو جاتے ہیں۔ جتنی شدید وابستگی ہوگی، اتنی ہی شدید غلط فہمیاں پیدا ہونے کا امکان رہتا ہے۔ اس لیے ہر قدم پر باہمی اعتماد کی فضا چاہیے۔ ورنہ اِسی طرح رونا دھونا ہوا کرتا ہے۔ جب تم بھی مجھ سے پیار کی دعویدار ہو، تو اعتماد کی فضا تخلیق کرنا تمھاری بھی ذمہ داری ہے۔

ٹھیک کہتی ہو۔ میں بہت زیادہ پیار کرتا ہوں مگر اسناد طلب بھی کرتا ہوں۔ اپنی اپنی طبیعت

اور رُجحان کی بات ہے۔ جو شخص چائے بھی خلوص سے پیتا ہو، کیا وہ پیار اور نفرت شدت سے نہ کرتا ہوگا؟ سچ جانو، تو مجھے اپنی نفرت سے بھی خوف آتا ہے اور اپنے پیار سے بھی۔ جبھی بہت کم لوگوں سے نفرت کرتا ہوں۔ پیار پر اب میرا زور نہیں اس کی شدت کا احساس تمھیں ہوگا؟

پیار کیا ہے؟ میں نے بہت سوچا۔ پیار کرنا، بیک وقت خدا ہونا بھی ہے اور پجاری ہونا بھی۔ خدا کی طرح پیار کی کائنات تخلیق کرنا اور پھر اپنی اس تخلیق کو سجدہ بھی کرنا۔ پیار کرنا در اصل پیار کروانا بھی ہوتا ہے اور جو وَن وے چلتے ہیں صرف اپنائیت کے احساس کی پرستش کرتے ہیں۔

میں اور تم عام سے انسان ہیں۔ ہوسکتا ہے ہمیں اپنے گرد و پیش سے اختلاف ہو مگر اِس اختلاف سے ہمارا انسان ہونا نہیں بدل سکتا۔ لوگ تمھیں ایک عام لڑکی کی شکل میں دیکھتے ہوں گے لیکن یہ میں ہوں، جس نے تمھیں دیوی بنا رکھا ہے اور یہ میں ہوں جو تمھیں پھر پوجتا بھی ہوں۔ تم نے بھی اِسی طرح مجھے جانے کیا بنا رکھا ہوگا؟ یہی اپنائیت کا تخلیقی رشتہ ہے۔ اپنائیت کے انہی شدید بندھنوں میں انسان سمٹ کر قریب ہو جاتے ہیں اور رشتے پھیل کر وسیع۔

تمھاری اپروچ ذرا مختلف ہے۔ تم الفاظ کی بجائے بند آنکھوں، تیز دھڑکنوں اور اکھڑی سانسوں کی زبان میں اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہو۔ پہلے پہل مجھے کچھ عجیب سا لگتا تھا کہ یہ لڑکی پہروں میرے ساتھ لپٹی رہتی ہے، اتنا پیار دیتی ہے کہ میرا خشک جسم تر ہو جاتا ہے، دنیا جہاں کی باتیں سنتی ہے مگر زبان سے کچھ نہیں بولتی۔ یاد ہے نا، میں نے ایک دن تم سے پوچھا بھی تھا اور تم جواب دینے کی بجائے مجھ سے لپٹ گئی تھیں۔ اُس دن سے پوچھنا چھوڑ دیا...... مجھے تمھارا یہ جواب پسند آیا تھا۔

اُس دن تم نے روتے روتے کئی بار ہچکیوں کے درمیان کہا ''خرم کے ساتھ میں آج تک باہر نہیں گئی، ہم کار میں بیٹھ کر ہی ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہتے ہیں۔ کبھی تھوڑے بہت ایک دوسرے کے قریب ہو لیے تو دوسری بات لیکن...... آپ کے ساتھ میں راتوں کو باہر رہی ہوں۔ جس قدر آپ میرے قریب ہیں، کوئی مرد کبھی میرے اتنے قریب نہیں آسکا۔ لیکن پھر بھی آپ ناراض ہیں۔ کیونکہ آپ مجھے چھوڑنا چاہتے ہیں۔''

جان جی! تمھیں بھلا کیسے بھلا سکتا ہوں؟ تمھیں چھوڑ کر کہاں جا سکتا ہوں؟ جو ہوا اُسے بھلا

دو، فراموش کر دو۔ وعدہ رہا آئندہ کبھی نہ لڑوں گا۔ کبھی بھی...... مجھے افسوس ہے، تمھیں کتنی تکلیف پہنچی ہے!...... تمھیں روتے پا کر میں انتہائی اذیت ناک احساس کی آگ میں جل رہا ہوں...... خدا کے لیے رونا دھونا اب بند بھی کر دو۔

آؤ کوئی اور بات کریں جو تلخئ فردا کو شیرینئ امروز میں بدل دے۔ جو تمھارے لمس سے جاوداں ہو جائے۔ آؤ کہ لب ورخسار اور چشم و ابرو کی بات کریں۔ کوئی ایسی بات جو اندیشہ ہائے دور دراز کے کرب سے نجات دلا دے۔ کوئی ایسا ذکر، جو بے خود کر دے۔

کچھ یاد ہے، ۲۴ کی رات باہر رہنے کا پروگرام تھا؟ یہ پروگرام بہت پہلے کا ہے، لہٰذا اس لڑائی کی وجہ سے کینسل نہیں ہونا چاہیے۔ وہیں صفدر کے ہاں چلیں گے۔ مسرت بھی وہیں ہوگی۔ تم نے چاہا تو 'اسالٹ' پر چلے چلیں گے۔ شہلا کہہ رہی تھی۔ اچھی فلم ہے۔ رات بھر تاش کھیلیں گے۔ اچھے اچھے گانے سنیں گے اور جی بھر کر گپ لگائیں گے۔

خرم کے فون کا فکر نہ کرنا۔ اُس کی کال کوئی نو بجے آیا کرتی ہے۔ اُس دن آٹھ بجے سے ہی فون خراب رہے گا۔ میں پہلے کی طرح یونیورسٹی ایکسچینج والے آپریٹر کو کہہ دوں گا۔ تم یہ بات مجھ پر چھوڑ دو۔ صبیحہ وغیرہ سے تربیلا والی سہیلی کے گھر رات رہنے کا بہانہ لگا لینا۔ پہلے بھی تو اِسی کا بہانہ بنا کر ہم باہر رہ لیے تھے اور کسی کو شک تک نہ گزرا تھا...... آگے تمھاری مرضی۔ ہم بہرحال حکم کے پابند ہیں۔

بھیگی پلکوں اور روتی آنکھوں کو بہت سا پیار

بہت ہی زیادہ

۲۴/دسمبر ۱۹۷۲ء
۱۲۹۔ سرسید ہال

دیوی جی

آج کی شام بھی کتنی ماتمی تھی، سیاہ بادل کتنے اُداس اُداس تھے۔ اس گھٹن میں اتنے گہرے درد بکھرے تھے اور اتنے بوجھل غم کہ جن کا بوجھ اُٹھا کر چلنا میرے بس میں نہ تھا۔ اگر خدا آسمانوں پر ہے تو یقین کرو، آج کی شام ہم ایسے لوگوں کے لیے سسکیاں لے رہا ہوگا۔

یہ سارا بوجھ اُٹھائے، میں کوئی سات بجے تک وحدت روڈ والے موڑ پر کھڑا رہا۔ تم نے چھ بجے آنا تھا مگر جانے آج شام ہی سے مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہو، کوئی تکلیف دہ حادثہ۔

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی! ہم دُور سے پہچان لیتے ہیں

بے چاری شاہدہ گرتی پڑتی کوئی سات بجے پہنچی اور بتایا کہ خرم آ گیا ہے۔ تم نہ آ سکو گی......
اور میں بمشکل اپنے آپ کو اُٹھائے واپس ہاسٹل پہنچا۔ صفدر وغیرہ نے رات بھر الگ انتظار کیا ہوگا۔
تمھاری زیادتی ہے۔ تمھیں پتہ تھا اُس کے آنے کا امکان ہے تو بھلا بتا ہی دیا ہوتا۔ اِس بار تو میں نے سارا بندوبست تم ہی پر چھوڑا تھا۔ اب کس قدر بدمزگی ہوئی ہے اور پھر جب تک 'وہ شخص' یہاں رہے گا ایک ہی جواب دو گی ''وہ دن میں تین بار چکر لگاتا ہے۔'' ٹھیک ہے 'وہ' تین بار آتا ہے اور تین بار تمھاری قربت اسے میسر ہوتی ہے ورنہ میری جان چکر لگانے کی کیا بات ہے؟ ہم تمھارے آگے پیچھے دن میں کوئی سو بار پھرتے ہوں گے۔

تم پھر کہو گی، میں حقیقت سے گھبراتا ہوں۔ درست سہی آخر صرف تمھارا خرم کے پہلو میں بیٹھنا، کار کا فراٹے بھرنا ہی تو تنہا حقیقت نہیں۔ یہ بھی تو حقیقت ہے کہ میں تم سے پیار کرتا ہوں اور

یہ بھی حقیقت ہے کہ تم تنہائیوں میں مجھ سے ملتی ہو۔ اُس بڑے آدمی کو کہو نا، یہ حقیقت بھی تسلیم کرے، پھر پتہ چلے گا۔ ہم میں سے حقیقتوں کو کون زیادہ پہچانتا ہے؟ وہ پہلے ہی لمحے تمھیں کار سے اتار کر چل دے گا۔ کبھی خودکشی نہ کرے گا، مجھے بھی قتل نہ کرے گا۔ تمھیں بھی بھلا دے گا۔ یہ بڑے لوگ اس معاملے میں بزدلی کی حد تک فراخ دل ہوتے ہیں۔ انھیں صرف اپنی خواہشوں سے پیار ہوتا ہے۔ کبھی میری یہ بات آزما دیکھنا، تمھیں پتہ چل جائے گا۔ ان لوگوں کی حقیقت میرے سگریٹ کے چھوڑے ہوئے کش سے بھی کم ہے۔

جن دو افسروں کے درمیان تم پھنسی پڑی ہو، اُن کی پہلی اور آخری خوبی افسری کے سوا اور کیا ہے؟ اِس سے ذرا ہٹ کر سوچو تو ایک اِس لیے منگیتر ہے کہ اتفاق سے تمھارے خاندان میں پیدا ہوا۔ دوسرا اِس لیے دل کے اندر ہے کہ وہ مجھ سے چند ماہ پہلے تم سے ملا تھا۔ یہ دونوں محض حادثے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ کیا مجھے اس بات پر سزا ملنی چاہیے کہ میں اتفاق سے تمھارے خاندان میں کیوں پیدا نہ ہوسکا؟ یا پھر تم سے پہلے کیوں نہ مل سکا؟ معاملہ اس کے برعکس بھی ہوسکتا تھا؟ اگر خرم میری جگہ ہوتا تو شاید وہ بے چارہ یہ کچھ لکھ رہا ہوتا......اور پھر یہ سارے حسین اتفاق افسروں ہی کے مقدر میں کیوں ہیں؟ اُن کے لیے ہر لمحہ اتفاق اور ہمارے لیے ہر اتفاق ایک سانحہ! میری سرکار یہ نہ تو تقدیر ہے اور نہ اتفاق ہے بلکہ ان دونوں کی جنم بھومی کا کرشمہ ہے۔ جسے لوگ لکشمی کے حسین نام سے یاد کرتے ہیں......کبھی تنہائی میں بیٹھ کر غور کرنا۔

میں گلہ نہیں کرتا، مجھے اِس ساری تکلیف دہ صورت کا احساس ہے، جس سے ہم دونوں گزر رہے ہیں۔ مستقبل کی طرف نظر کرو تو دُکھوں کی اُبلتی دلدل کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور حال ایک ایسا دہکتا الاؤ بن چکا ہے جہاں سے پیچھے مڑنا ناممکن، ٹھہرنا دشوار تر اور آگے کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ میں نے کئی بار تمھاری اور اپنی زندگی کے حوالے سے اِس سارے قصے کے مختلف پہلوؤں کو جانچا ہوگا۔ مجھے تو یہ کوئی انوکھی سٹوری دکھائی پڑتی ہے۔ جسے سلجھانا شاید میرے بس میں نہیں۔

تمھاری زندگی کے فسانے میں میجر صاحب کا رول ولن کا سا ہے۔ روایتی وِلن جو اتفاق سے کزن بھی ہوا کرتا ہے۔ اِس امیر کزن کے ساتھ ہیروئین کا رشتہ طے ہو جاتا ہے۔ ہیروئن اُس وقت آٹھویں نویں جماعت میں تھی۔ ناسمجھ اور بھولی بھالی سی۔ جوں جوں وہ جوان ہوتی ہے کسی

نامعلوم گھٹن کے احساس میں گھرتی چلی جاتی ہے۔ اپنے منگیتر کو وہ کچھ زیادہ پسند نہیں کرتی۔ یونیورسٹی میں اُس کے پیچھے کئی لڑکے پڑتے ہیں اور ان میں سے ایک جو کسی باہر کے ملک سے آیا ہے اُس کے خاصے قریب آجاتا ہے۔ مگر اسی دوران ایک دوسرا امیر زادہ فلمی ہیرو کی طرح نمودار ہوتا ہے۔ ایک شام ہیرو، اُسے فون کرتا ہے اور انتہائی دُکھ بھرے انداز میں اُس کی منگنی والی خبر کی تصدیق چاہتا ہے اور پھر دوسری صبح سے وہ شیو بڑھائے، بال بکھرائے اور منہ پھلائے روایتی ہیرو کی طرح کار کے ریکارڈ پلییر پر غم کی موسیقی بجاتا ہوا، ہیروئن کے طواف لینا شروع کر دیتا ہے۔ ہیروئن بھی اُس کی جانب متوجہ ہوتی ہے اور آخر ایک رات فیصلہ کر لیتی ہے کہ جب تک وہ یونیورسٹی میں ہے، ہیرو سے ربطِ اُلفت بڑھانے میں کوئی حرج نہیں۔ شادی کو ابھی دو سال پڑے ہیں اور یوں بھی منگیتر کو خاص پسند بھی نہیں کرتی۔ سلسلہ چل نکلتا ہے جو بعد میں سنجیدگی اختیار کر لیتا ہے۔ یہاں تک تو سٹوری بہت واضح ہے کہ ایک افسر کی بیٹی ایک افسر کو پسند کر رہی ہے اور دوسرے افسر سے جان چھڑانا چاہتی ہے۔ گھر والے تھوڑا بہت شور مچا کر مان ہی جائیں گے اور اختتام میں ہیرو، ہیروئن کی شادی پر ڈراپ سین ہو جائے گا۔ خرم اِس افسانے کا روایتی ہیرو ہے۔

لیکن اِسی دوران ہیروئن، یونیورسٹی کی سیاست میں دلچسپی لیتی ہے۔ ایک غریب مگر خاصا عجیب و غریب سا لڑکا جو اپنے حلیے سے عیسیٰ لگتا ہے، ہیروئن کو پسند کرنے لگتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد ہیروئن بھی اُس کی جانب کھنچ جاتی ہے۔ دونوں ملنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ تیسرا آدمی اگرچہ خاصا کرخت ہے، مگر بہت خلوص سے زندہ رہ رہا ہے۔ اُسے بہت سے لوگ جانتے ہیں اور شاید درس گاہ کا کوئی حصہ ایسا نہ ہوگا جہاں کھڑے ہو کر اُس نے اپنے مخصوص انداز میں تقریریں نہ کی ہوں گی۔ ہیروئن اُس کے ساتھ رہنا شروع کر دیتی ہے۔ اُس کی باتوں کو بھی پسند کرنے لگتی ہے۔ ہیروئن حیران بھی ہوتی ہے کہ لوگ اس آدمی کو شیطان سمجھتے ہیں یا پھر رحمان۔ کوئی اسے قتل کرنے کے درپے تو کوئی اس کے لیے مرنے کو تیار۔

مگر یہ آدمی ہیرو ہے نہ ولن، بلکہ کسی تیسرے مقام پر کھڑا ہے۔ اُس کا کوئی مستقبل نہیں، کوئی کار، کوئی دولت، کوئی اور چیز اُس کے پاس نہیں۔ وہ ایسا زاویہ ہے جو پہلے سے موجود مثلث کے کسی کونے پر پورا نہیں اُترتا۔ وہ جس مقام پر کھڑا ہے، وہاں سے چیزیں بہت مختلف نظر آتی ہیں۔ اُس

یکم جنوری ۱۹۷۳ء
۱۲۹۔ سر سید ہال

لڑکی

آج سوموار تھا۔ بقول تمھارے نیا سال، نیا دن اور نئی تاریخ۔ ہم نے بھی نئے سال کی ابتدا کے ٹو کے سگریٹ، بے ذائقہ چائے اور چھاتی میں ہلکے ہلکے درد کے احساس سے کی۔ کیفے پہنچا تو سبھی لڑکیاں موجود تھیں۔ تم لوگوں نے نئے سال کی خوشی میں انگریزی گیت گائے۔ سیٹیاں بجائیں اور اپنا یہ 'جنگی ترانہ' بار بار 'عوام' کو سنایا

پڑے ہیں ہم اکیلے۔ کوئی بانہوں میں ہم کو لے لے

تمھاری 'ساری سپاہ' نے تقریباً بارہ بجے سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ میں پڑاؤ ڈالا اور کوئی شور مچایا، اُف پناہ! میں اُس وقت منظور اعجاز کے ساتھ اپنے شعبے کے لان میں بیٹھا تھا۔ انہوں نے معنی خیز انداز میں ہنستے ہوئے پوچھا ''تمھاری مُریدنیاں، آج بڑی خوش خوش لگ رہی ہیں۔'' میں نے بے معنی مسکراہٹ کے ساتھ بات گول کر دی۔

اُس وقت شاید ایک بجا ہوگا۔ جب میں تم سے ملا۔ ابھی ہم بات کر ہی رہے تھے کہ دُور سے خرم کی کار آتی دکھائی دی اور اُس شخص کو دیکھو سو گز پر ہی کار روک کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے میں اُسے کھا جاؤں گا۔ میرا دل تھا آج اُسے چند منٹ وہیں کھڑا رکھوں۔ مگر تمھاری حالت دیکھ کر مجھے ترس آ ہی گیا۔ مجھے یوں لگا اگر بیک وقت ہم دونوں تمھارے سامنے آ گئے تو تم پاگل ہو جاؤ گی۔ تم خدا حافظ کہہ کر تین بار اُس کی جانب چلیں اور پھر پلٹ آئیں۔ جانے تم کیا کہنا چاہتی تھیں مگر ہر بار کہہ نہ پائیں۔ میں نے سوچا، جتنی دیر میں وہاں رہوں گا، خواہ مخواہ تمھیں ذہنی پریشانی ہوگی۔ میں نے کہا ''تم اب جاؤ'' اور خود وہاں سے لوٹ آیا۔

پھر کوئی دو بجے تم ساری سہیلیاں، خشک نہر کی ریت پر چلتے چلتے واپس ہاسٹل میں پہنچیں۔

کے سامنے ہیروئن، ہیرو کے ساتھ ملتی ہے۔ مگر اُس کے حوصلے کا یہ عالم ہے کہ وہ سب کچھ برداشت کرتا رہتا ہے۔ وہ ہیروئن سے بہت پیار کرتا ہے۔ اتنا زیادہ کہ ہیروئن بھی اس بہتے طوفان سے ڈرتی ہے، مگر غم کے اندھیروں اور غیر یقینی صورتِ حال نے اُسے پچھاڑ رکھا ہے۔ یہ کردار، یہ تیسرا آدمی، یہ کوئی نئی بات ہے۔

میری نظر سے ایسا کوئی کردار پہلے نہیں گزرا۔ یہ غیر روایتی کردار ہے۔ اس تیسرے کردار کی وجہ سے ہیروئن کا کردار بھی انتہائی عجیب صورت اختیار کر لیتا ہے۔ وہ ہیرو کے ساتھ ساتھ اس تیسرے کردار سے بھی پورا پورا پیار کرتی ہے۔ یہ ہیروئن کو بھی غیر روایتی بنا دیتا ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں...... نتیجہ کیا نکلے گا؟ کیا میں ہی ہار جاؤں گا...... کچھ تو بتاؤ؟؟؟

پیار

پھر ہاسٹل کی پچھلی جانب نعیم اور اُس کی منگیتر کے ساتھ سیر ہوتی رہی۔ کوئی ڈھائی بجے کے قریب بخاری والے ہاسٹل میں جانا ہوا۔ تین بجے مہ جبین اور طلعت کے ساتھ نہر والی سڑک پر ٹہلنا ہوا۔ دوبارہ ہاسٹل کے گیٹ کے سامنے قہقہے پھوٹتے رہے۔ خرم تو کہیں جا کر شام کو آیا اور تم اپنے پورے بریگیڈ سمیت کار میں دھنس گئیں۔ کار حسبِ معمول ہمیں دھول کرتی ہوئی لبرٹی مارکیٹ کی جانب سرک گئی۔ کوئی ساڑھے آٹھ بجے واپسی ہوئی۔ صرف ایک بات قابلِ ذکر تھی کہ تم جاتے وقت پچھلی سیٹ پر بائیں جانب بیٹھی تھیں، مگر واپسی پر تم اپنی اصل جگہ پر تھیں۔

کچھ سنا تم نے؟ اِس دنیا میں ہم سے حقیر لوگ بھی بستے ہیں۔ جن کی زندگی نشان پا گنتے گنتے بیت جاتی ہے۔ میں نہیں کہتا یہ سارا وقت میرے نام کر دو۔ لیکن کوئی لمحہ ایک سانس جتنا طویل ہی سہی، اُس شخص کو بھی ملنا چاہیے، جس کے پاس تمھارے لمحات کی سب سے زیادہ قدر ہے۔ چلو خرم سے تمھارا ملنا، مجبوری سہی۔ مگر دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنا وقت کیوں قتل کرتی رہتی ہو۔ صبیحہ، غزالہ، یا مہ جبین اپنے اپنے مقام پر سبھی لوگ اچھے ہیں۔ مگر تمھارے قدم تو نہیں چومتے، مجھ جتنا پیار تو نہیں کرتے...... عورت! کبھی تو، کچھ تو اپنے دماغ سے بھی سوچ لیا کرو۔

سبھی کہتے ہیں آج نیا سال تھا۔ مگر مجھے تو اِس کی ابتدا کا کوئی سراغ نہ ملا۔ انسان بھی کتنا کوتاہ فہم ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ کسی خاص دن یا وقت کے کسی خاص نکتے پر نیا سال شروع ہوتا ہے۔ پھر وہ اس کی خوشی منانے بیٹھ جاتا ہے۔ یہ نہیں سوچتا کہ زمانہ تو اُس کے بنائے ہوئے مہ و سال کی قید سے آزاد ایک طوفانِ بلا ہے اور ہم تم اس بہاؤ میں دو قطروں کی مانند صرف چند لمحوں کے لیے باہم ٹکرائے ہیں۔ ہم نے پھر سے فطرت کے اِسی طوفان میں کھو جانا ہے۔ اندھے راستوں پر، انجانی منزلوں کی جانب، ان دیکھی دنیاؤں میں جہاں سے لوٹ کر کوئی نہیں آتا۔ دہرانا اور لوٹنا فطرت کی عادت نہیں۔

زندگی کے اس بہتے سفر کی ابتدا ہے نہ کوئی انتہا۔ ایک لمحہ دوسرے لمحے کے اندر موجود ہوتا ہے، جو ہر لمحہ نئے سے نیا ہے۔ چلو خیر! اپنی ناسمجھی کی بنا پر ہی اگر کوئی اِسے نئے سال کا آغاز جان کر خوش ہو لے تو اسے بھی غنیمت جاننا چاہیے۔

اگر تم بضد ہو کہ آج واقعی نیا سال ہے تو یقین جانو، یہ نئے دُکھوں کا سال ہے۔ پرانے

دُکھوں کی کوکھ سے جنم لینے والے نئے دُکھوں کی ابتدا کا پیغام، تمھارے اسی نئے سال کے کسی حصے میں ہم دونوں نے یونیورسٹی کو خیر باد کہنا ہے۔ اِسی نئے سال نے تمھیں مجھ سے چھین لینا ہے۔ پھر شاید کوئی ایسا نیا سال نہ آئے، جس کے پہلے دن تم مجھ سے چند قدم دُور بیٹھی، خوشی کے گیت گاؤ۔ پھر شاید ایسی حسین صبح میرے مقدر میں نہ ہو، جس کی آمد پر تمھارے مسکراتے ہونٹوں سے 'نیا سال مبارک' سنوں۔ بہت ممکن ہے کوئی نیا سال تمھیں تو خوشی کے گیت گاتے رہنے کے قابل کر دے، مگر میں اُس لمحے تمھاری آواز کے رس سے جانے کتنے دُور زندگی کے بوجھ تلے سسک رہا ہوں گا۔ تم ہی بتاؤ، یہ وقت، یہ عمر، فراغت کے یہ لمحے، یہ میٹھے میٹھے درد، یہ سب کچھ بھلا کہاں ہوگا؟

مجھے تمھارے اِس نئے سال کی حقیقت کا احساس بھی ہے اور آنے والے سیاہ لمحات کی پرچھائیں بھی دیکھ رہا ہوں۔ جبھی میں اُداس اُداس تھا۔ تم نے 'نیا سال مبارک' کہا تو میں بمشکل تمام مسکرا پایا تھا۔

کل شام تمھیں ایک نظر دیکھنے ہاسٹل کی جانب گیا۔ خوشیوں کے بادل تمھارے اردگرد برس رہے تھے اور تم ساڑھی کا پلو وا کیے قہقہے سمیٹنے میں مصروف تھیں۔ تمھارے اردگرد 'حوروں' کا جمگھٹا تھا۔ ساتھ کچھ 'فرشتے' بھی تھے۔ میں نے اپنی حسرتوں کی جہنم میں کھڑے ہو کر تمھاری ہنستی بستی کائنات کو دیکھا۔ پھر دُور ہی سے لوٹ گیا کہ تمھارے بہشت پر مجھ گناہ گار کا سایہ نہ پڑے۔ میں تو جنت سے نکالا ہوا انسان ہوں، ڈرتا ہوں کہ تمھارے 'رضوان' نے مجھ جہنمی کو دیکھ لیا تو اسے تکلیف ہوگی۔

لو آج کی تازہ خبر سنو! تمھارے 'سٹنٹ مین' نے ایک بہت حسین لڑکی کو رام کر لیا ہے۔ یقین کرو، بہت ہی خوبصورت شے پر شب خون مارا ہے۔ فائن آرٹس کی کوئی نایاب تصویر ہے۔ سنا ہے کئی گیلریوں میں اس کی پہلے بھی کامیاب 'نمائش' ہو چکی ہے۔ دیکھو نا اُس غریب کی بھی خدا نے سن ہی لی۔ تمھارے پیچھے پھر پھر کر خوار ہو گیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں یہ خبر یحییٰ خان کے اقتدار چھوڑنے سے زیادہ اہم ہے اور اسے 'قومی خبرنامے' میں نشر کیا جانا چاہیے۔ جرنلزم والی 'چے گویرن' آج ملی تھی۔ کہہ رہی تھی تم سے بھی ملنے جائے گی۔ پھر آئی تھی کیا؟ بڑی اچھی لڑکی ہے۔

ہاں سچ، دن کے وقت میرے ساتھ جو سمارٹ سالڑکا تھا، میرا دوست تعظیم ہے۔ اِس وقت میرے ساتھ ہی کمرے میں لیٹا ہے۔ لندن میں تھا تو میں نے اُسے تمھارے متعلق بتایا تھا۔ اُسے بہت شوق تھا، ویسے اس نے تمھیں پسند کیا ہے۔ (اس شخص کا اس میں کیا کمال تم ہو ہی اِس قابل)۔ اُسے دیکھو پی ایچ ڈی کر کے یہاں بھاگ آیا ہے۔ خیر جلد ہی راہِ راست پر آجائے گا۔ تم سے ملواؤں گا۔ بڑا پیارا آدمی ہے۔

اب تو ہونٹ بھی جل اُٹھے ہیں......

......پیار......

۱۵/جنوری ۱۹۷۳ء
۱۲۹۔ سرسید ہال

کنول

شاہدہ بھی کیا سادہ لوح ہے۔ ذرا سی بات تھی اُس نے مجھے دوڑا دوڑا کر تقریباً شہید کر دیا۔ ہم تینوں تمھارے ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھے تھے تو وہ کس قدر پریشان تھی، حالانکہ پریشان تمھیں ہونا چاہیے تھا۔ ویسے میں نے سارا پتہ کرالیا ہے۔ کوئی وارنٹ وغیرہ نہیں۔ کوئی ایسی بات ہی نہیں۔ یوں بھی ہم نے کون سا ہنگامہ کیا ہے؟ آخر پولیس کس خوشی میں ہمیں گرفتار کرے گی؟ محض افواہ تھی اور تم جانتی ہو، اپنی قوم اِس معاملے میں خاصی حد تک خود کفیل واقع ہوئی ہے۔ فکر مند ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ پولیس نے اپنے معمول کے مطابق تمھارا ایڈریس لیا ہے۔

دراصل پولیس والے اپنے پرانے غم گسار ہیں۔ غریب بڑا ہی دھیان رکھتے ہیں۔ جہاں پہنچوں، اُن کا کوئی نہ کوئی آدمی میرے استقبال کے لیے ضرور موجود ہوتا ہے۔ بے چارے میرے ملنے جلنے والوں کا بھی پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ انتہائی خلوص سے اُن کا ناک نقشہ اور اتا پتا نوٹ کرتے ہیں۔ اس ذرہ نوازی کے لیے میں جنرل ایوب خان کا بہت احسان مند ہوں۔ اُسی کے حکم سے یہ اہتمام ہوا تھا۔ ورنہ کہاں میں نادار اور کہاں یہ شاہانہ سلوک؟ ایوب خان تاریخ کی شکست وریخت کا شکار ہو گیا، مگر 'پیار' کی زنجیر کا یہ سلسلہ ابھی تک نہیں ٹوٹا۔ پچھلے تین چار ماہ سے تم اکثر و بیشتر میرے ساتھ نظر آتی رہیں۔ پولیس والے جان گئے کہ یہ 'مہمان' دل کے اندر چلا گیا ہے۔ لہٰذا تمھاری دیکھ بھال کے لیے اُنھوں نے تمھاری فائل بھی کھول دی ہوگی۔ ڈیپارٹمنٹ سے انھوں نے تمھارا ایڈریس مانگا۔ یقیناً میرا ذکر بھی چلا ہوگا۔ کلرک سمجھا، شاید ہم دونوں کو پولیس گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ اُس شریف آدمی نے کسی سے بات کی ہوگی۔ بس پھر کیا تھا...... جنگل میں آگ پھیل گئی۔ یونیورسٹی کے خشک جنگل میں افواہوں کی آگ یوں بھی بہت تیزی سے پھیلا کرتی ہے!

پولیس والوں سے میں بہت تنگ رہا کرتا تھا۔ اِدھر اُن کا ذکر چھڑا، اُدھر ذہن نے ابکائی لی۔ میرا خیال تھا، بہت ہی بے ذوق اور خشک قسم کے لوگ ہوتے ہوں گے۔ ان کے نزدیک انسان زیادہ سے زیادہ چور ہوسکتا ہے، ڈاکو یا پھر سیاست دان...... کہ پوری زندگی بے چارے انہی کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں۔ ان کی دنیا، خشک سیاسی تقریروں، پولیس مقابلوں، لاٹھی چارج اور آنسو گیس کے دھوئیں سے عبارت ہے۔ دل کی دھڑکنوں سے بکھرتی آرزوئیں اور اُن سے پھوٹتے معانی بھلا وہ کیا جانیں؟ مگر اب کے انہوں نے میرے سارے شکوے دُور کر دیئے۔ کیا رُومانی پیش گوئی کی ہے۔ میری کوئی مانے تو انہیں صرف رُومانی رپورٹیں لکھنے پر لگا دینا چاہیے۔ ہمارے ادب کے بے معنی افسانوں سے اُن کی رپورٹیں لاکھ درجے بہتر ہوں گی۔ کم از کم ہمارے معاملے میں تو انہوں نے یہی ثابت کیا ہے۔ یہ اُن کی ساری زندگی کا واحد نیک کام ہے، جس کے سہارے شاید بخشے جائیں۔

حیرت ہے! تمھارے اتنے بڑے 'افسر' نے اُس دن صرف اتنی سی بات پر بُرا منا لیا! اُس خوش نصیب کو تو صرف چند لمحے تمھارا انتظار کرنا پڑا۔ اُسے زندگی میں پہلی بار تم سے سو گز پرے رُکنا پڑا۔ مگر برداشت نہ کر پایا اور فوراً ہی چلا اُٹھا "میں تمھارا نوکر نہیں"۔ پھر ناراض ہو کر اُسی وقت چل بھی دیا۔ میں تو چاہتا تھا کہ تم کو تھوڑی دیر اور نہ جانے دوں، لیکن تمھارے خرم کو تکلیف نہ دے سکا۔ اور اُسے دیکھو......

ہم مرد، عورت کے معاملے میں بڑے یہودی واقع ہوئے ہیں۔ عورت کو سکوں کی مانند تجوری میں بند رکھنا چاہتے ہیں۔ سکے اپنی مرضی سے گردش کرنا چاہیں تو بھلا ہم کہاں خوش ہوں گے؟

تم ہر وقت اُس کے سامنے میری تعریفیں کرتی رہتی ہو، اس نے بُرا تو منانا ہی تھا۔ کوئی کب برداشت کرتا ہے کہ کنیز اپنے آقا کے سامنے کسی دوسرے مرد کے لیے لڑتی پھرے؟ اس طرح مردانگی اور برتری کے احساس کو بہت ٹھیس پہنچتی ہے۔ انسان بن کر سانس لینا بہت دشوار کام ہے، میری سرکار! ویسے اُس کا دیا ہوا 'ٹائیٹل' مجھے پسند آیا۔ 'رُوحانی پیغمبر'! کیا خوبصورت تشبیہ دی ہے۔ آدمی مقامِ معرفت سے کچھ کچھ آشنا لگتا ہے۔

پچھلے دو ہفتوں کا 'کوٹہ' باقی ہے۔ وہ رات والا پروگرام بھی بیچ ہی میں لٹک گیا تھا۔ اب فوراً

بن جانا چاہیے۔ یوں تو ہم دن میں کئی بار ملتے ہیں لیکن کیا فائدہ؟ دوسروں کے سامنے اجنبی بننا پڑتا ہے۔ تم مجھے دنیا کے سامنے اپنا کہنے کی اجازت دو، میں تمھیں باہر چلنے کو نہیں کہوں گا۔

امتحانوں کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اپنی نسل یونیورسٹی چھوڑتی نظر نہیں آتی۔ مایوسیوں میں گھرے لوگ ہیں۔ یونیورسٹی سے باہر کہاں جائیں؟ جس حساب سے مطالبے داغ رہے ہیں، اُمید ہے امتحان ملتوی ہو جائیں گے۔

تم بھی بہت عجیب ہو، پہلے بھی بتایا ناز ہمارے خلاف افواہیں عام کرتی رہتی ہے لیکن اُسے ہر وقت ساتھ چپکائے پھرتی ہو۔

دیکھو، خرم کے سامنے میری تعریف نہ کیا کرو۔ اُسے اور شک ہو جائے گا۔ وہ کوئی طنز کرے، تو اُس سے لڑو بھڑو گی۔ وہ شریف آدمی تو یہاں سے کراچی جا بیٹھے گا اور تمھارے آنسو مجھے ہی خشک کرنا پڑیں گے۔ اب تو مجھے تمھارا 'روحانی پیغمبر' کہتا ہے پھر نا جانے کیا کہے گا؟

میری جان! دُکھ پہلے ہی کیا کم ہیں کہ ان میں اور اضافہ کریں۔ اب تو کوئی سکھ چین کی بات کرو۔ پیار کی بات۔

۱۶/ جنوری ۱۹۷۳ء
کلر سیداں (درکالی شیر شاہی)

رانی

آج عید ہے، میں اپنے گاؤں سے باہر ایک ٹیلے پر بیٹھا، تمھیں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میرے قریب 'چیتو' بیٹھا ہے، میرا بھتیجا...... بڑا ہی سمارٹ اور پیارا بچہ ہے۔ ذرا دیکھو تو، کتنے انہماک اور معصومیت کے ساتھ مجھے لکھتے ہوئے دیکھ رہا ہے، جیسے میرے درد کو محسوس کر رہا ہو۔ اس کی گہری سیاہ آنکھوں کے پیچھے خاموشی کا سمندر موجزن ہے......

اس لمحے دن کا کوئی ایک بجا ہوگا۔ موسم انتہائی حسین ہو رہا ہے۔ کھلی فضاؤں کی آغوش میں ہلکے ہلکے بادل جوان اُمنگوں کی طرح مچل رہے ہیں۔ دھرتی کے سینے پر سرسراتے کھیت...... دل کی تشنہ آرزوؤں کی مانند بے چین ہیں۔ خنک ہوائیں، نہایا دھویا اُجلا اُجلا سا ماحول گاؤں کے عین وسط میں 'پینگ' کے اردگرد جمع ہونے والوں کے قہقہے، ہر جانب سادگی کی برسات...... صرف تمھاری کمی ہے۔

لو آج ہم نے بھی نماز پڑھی! لوگ تھے کہ سجدے پر سجدہ کیے جاتے تھے۔ ہم نے ذرا گردن جھکائی اور تمھیں اپنے اندر مسکراتے پایا۔ لوگ الفاظ کے سحر میں کھوئے اُٹھتے بیٹھتے رہے، ہم نے ہر سانس کے ساتھ تمھارا نام لیا۔ بالآخر لوگ تھک ہار کر بیٹھ گئے اور اپنی اس مشقت کا معاوضہ چاہا۔ مانگنے کے لیے ہاتھ پھیلے۔ زندگی کی ہر ضرورت کے لیے لب ہلے...... گویا خدا نہ ہوا کوئی ساہوکار ہوا، جس کے پاس بہی کھاتہ کھلا ہے۔ اِس جہاں میں قرض دیئے جاتا ہے، کسی اور دنیا میں بمعہ سود وصول کرلے گا۔ میں سوچ رہا تھا یہ بھی کیا لوگ ہیں...... اَن دیکھے خدا کو پوجتے ہیں، مگر اُس سے اتنا پیار بھی نہیں کرتے، جتنا تم سے میں کرتا ہوں...... سچ جانو، مجھے تو یقین ہے، یہ سارے لوگ خدا پر یقین نہیں رکھتے، صرف اپنے آپ کو فریب دیتے ہیں، ورنہ اُن کی ایسی حالت تو ہونی چاہیے، جیسے

میری ہے...... انسان کا بھی جواب نہیں۔ اپنی آرزوؤں کا ایک بہت بڑا بت بناتا ہے، کبھی اِسے پوجتا ہے اور کبھی توڑتا ہے...... حسرتوں کی اِسی دلدل پر چلتے چلتے ...... بالآخر گم ہو جاتا ہے...... مگر خود فریبی سے باز نہیں آتا۔ مولوی صاحب نے خطبہ دیا اور اپنے عاشق خدا ہونے کے بہت دعوے کیے۔ حضرت کا وزن تین من سے اُوپر ہی ہوگا...... بھلا عاشقوں پر اتنی چربی ہوا کرتی ہے......؟

......نماز کے بعد یارانِ کہن سے قصہ ہائے غم کا ذکر چلا، بھولی بسری یادوں کے سمندر میں بیتے لمحات کی خوابیدہ لہریں اُبھریں، گئے زمانوں کے ہلکے ہلکے سائے، گہرے ہوئے اور ہم سب دوست کافی دیر تک ماضی کے سراب میں بھٹکتے پھرے۔ گزرے دنوں کی تلخ باتوں کا ذکر بھی آج شیریں تھا...... انسان بھی کتنا ماضی پرست ہے۔ حال کے تلخ حقائق سے خوف زدہ، مستقبل کے سیاہ اندھیروں سے مایوس، ماضی کی تہوں میں سر چھپاتے چھپاتے، ایک دن خود ماضی بن جاتا ہے۔

ہمارے گاؤں میں...... ایک بوڑھا درخت سر جھکائے کھڑا ہے۔ جوان لڑکیاں اور لڑکے اِسی کے تنے پر خوشیوں کا جھولا ڈالتے ہیں اور پھر اِسے دل میں چھپی خواہشات کی طرح، اُونچے سے اُونچا لے جانے کا مقابلہ کرتے ہیں۔ بوڑھے، بچے اور عورتیں ایک جانب بیٹھے اِس منظر سے لطف اُٹھاتے ہیں۔ اکثر ذکر چلتا ہے کہ فلاں کی نانی یا دادا نے بوڑھے درخت کی ان ٹہنیوں کو پاؤں لگائے تھے۔ یہ دن جوان لوگوں کا دن ہے...... چنانچہ مزہ بدلنے کے لیے کبھی کبھار وہ اپنی ماؤں باپوں یا اس عمر کے بوڑھے لوگوں کو گھسیٹ کر پینگ میں لا بٹھاتے ہیں۔ ہر جانب سے قہقہے چھوٹتے ہیں۔ فقرے اُچھالے جاتے ہیں...... اور جلد ہی پینگ پر بیٹھا شخص ہانپ کر نیچے اُتر آتا ہے۔ میں بھی، پینگ کا بہت رسیا ہوا کرتا تھا۔ مگر جوں ہی فضا میں بلند ہوتا، ذہن میں کھسر پھسر شروع ہو جاتی بار بار ایک ہی خیال آتا ''اتنی بلندی سے گر گیا تو پھر کیا ہوگا......'' اور نیچے اُتر آتا۔ بلندی سے میں کبھی خائف نہ تھا۔ البتہ بلندی سے گرنے کا خوف مجھے ہمیشہ رہا۔ آج بھی ہے۔ مگر جھولا ڈالنے کا سارا اہتمام، پھر اس کے نیچے طوفان بدتمیزی برپا کرنا، ہر کسی کو 'ہُوٹ' کرنا یہ سارے کام میرے ذمہ ہوا کرتے تھے۔ جب میری باری آتی تو سبھی لوگ مجھے انتہائی خلوص سے 'ہُوٹ' کرتے۔ اب کی بار پہلی دفعہ میں جھولے کی جانب نہ گیا۔ چھوٹے موٹے سبھی گھر پہنچ گئے۔ بہتیری منت سماجت کی مگر وہاں سنتا کون؟ مجھے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ جانتی ہو یہ لوگ مجھ سے ذرا

بھی ایمپریس نہیں۔ ان کے لیے میں ابھی تک گاؤں کا وہی کھلنڈرا بچہ ہوں۔ میری بے طرح بڑھی شیو اور طویل زلفیں دیکھ...... مجھے یہ سبھی 'سائیں' سمجھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے عشق میں ناکامی کے بعد میں 'جھلا' سا ہوا پھرتا ہوں۔ اُوپر سے بہت پڑھ لیا ہے، جبھی یہ حالت ہوگئی ہے۔

'پینگ' کے اردگرد ایک دنیا جمی تھی۔ میں نے رسم پوری کی...... اور جلد ہی نیچے اُتر آیا۔ قریب پڑی ایک چارپائی پر بیٹھی بوڑھی عورتیں ذرا سی سمٹیں اور میں اُن کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ اتنے میں میری بھتیجی شاہدہ ایک چھوٹے سے گول مٹول بچے کو اُٹھائے میرے پاس لے آئی۔ ان چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کو تو جیسے دوسروں کے بچے اُٹھائے اُٹھائے پھرنے کا خبط ہوتا ہے۔ میں نے ہاتھ پھیلائے تو بچہ ہمک کر میرے پاس آ گیا۔ قہقہوں کا ایک طوفان سا پھٹ پڑا۔ حیران ہوا کہ ماجرا کیا ہے؟ پاس بیٹھی ایک عورت نے پوچھا ''بچہ اچھا لگتا ہے تمھیں؟'' میں نے کہا ''کافی اچھا ہے۔'' اس پر پھر ایک قہقہہ لگا۔ دُور کونے میں بیٹھی ارشاد ہمیشہ سے کچھ زیادہ شرمائے شرمائے مسکرا رہی تھی۔ ہماری نظریں ملیں اور اُس نے ہونٹ بھینچ لیے۔ کسی نے کہا ''لوگوں نے تو گھر بسا لیے۔ اب تو بھی شادی کر ہی لے۔'' مجھے بعد میں پتہ چلا یہ سب پلاننگ تھی۔ مجھے وہاں لایا ہی اس لیے گیا تھا کہ ارشاد سسرال سے آئی ہوئی تھی اور یہ بچہ اُسی کا تھا۔ بچے بوڑھے سبھی جانتے تھے کہ ہم نے کبھی ایک دوسرے کو چاہا تھا۔ چنانچہ سبھی نے مل کر یہ مذاق کیا تھا۔

جانتی ہو، جس ٹیلے پر میں بیٹھا ہوں، یہاں میری کتنی یادیں بکھری پڑی ہیں، جیسے کل ہی کی تو بات ہو۔ میں یہاں اپنے بچپن کے ساتھیوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلا کرتا تھا۔ اتوار کے دن سکول سے چھٹی ہوتی تو ہم مویشی چرانے اِدھر آتے، اِسی ٹیلے پر بیٹھ کر ہمارے گاؤں کا ایک بوڑھا انتہائی پُرسوز آواز میں سیف الملوک گایا کرتا تھا۔ بے چارہ اب تو خاک ہو چکا۔ میرے ذہن میں اُس کی آواز کا رس آج بھی موجود ہے۔ وہ اکثر یہ بند گایا کرتا تھا۔

سدا نہ ہتھیں مہندی لگسی، سدا نہ چھنکن ونگاں

سدا اُڈاراں نال قطاراں، رہیاں کدوں کُلنگاں

سَدا نہ چھوپے پا محمد، رَل مِل بہناں سَنگاں

وہ بچپن کا انمول زمانہ تھا۔ اِن الفاظ کے معنی سے کوئی آشنائی نہ تھی۔ ذہن کی دنیا، گاؤں

کے اِن سیدھے سادھے راستوں تک محدود تھی۔ اب محسوس ہو رہا ہے کہ واقعی خوشیوں کے لمحات، دوستوں کا ساتھ، طوفانِ محبت، بہکے بہکے جذبات، یہ عمر، یہ زندگی اتنی تیزی سے گزر جاتی ہے، جتنی تیزی سے تمھاری قربت کے لمحات، دیکھو تو...... یہ وہی جگہ ہے، وہی مٹی، وہی ماحول، مگر میں ویسا نہیں۔ میرے ذہن پر سوچوں کا بوجھ ہے۔ غم زدہ، مایوس اور پریشان ہوں۔ پہلو میں ایسا درد لیے پھرتا ہوں، جس کا علاج کسی کے پاس نہیں۔ کوئی بھی میری مدد نہیں کر سکتا۔ نہ دوست، نہ ماں باپ، نہ کوئی اور...... وہ زمانہ کتنا اچھا تھا، ان ہی کھیتوں میں تتلیوں کے پیچھے بھاگ کر خوش ہو لیتا تھا۔ کاش میں تمھاری درس گاہوں میں نہ پہنچتا۔ جہاں میں نے اپنی سادگی کھو دی ہے۔ مجھ سے میں ہی بچھڑ گیا ہوں۔ اس کے بدلے مجھے کیا ملا؟ تم ایسے آشنا، دُکھ کی باتیں، غم کے فسانے، درد کے سانس، محرومیاں، ناکامیاں...... جہاں قدم قدم پر مجھے اپنی بے مائیگی کا احساس ہوا۔ جہاں ہر طرف سنگِ مرمر سے تراشے بت ملے۔ جن کی آنکھیں چاندی اور دل سونے کے تھے۔ مگر ان کے شفاف چہروں پر موت کی سی بے حسی تھی۔ میں گوشت پوست کا انسان، ان پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر مسخ ہو گیا۔ میرا جسم جل اُٹھا، دل پھوٹ بہا...... اور میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا۔ میرے زخمی احساس سے خون کے فوارے اُبل رہے ہیں۔ مگر بتوں کی اِس دنیا میں کوئی ایسا نہ تھا، جو خون کی اِس گنگا کو دیکھ ہی لیتا۔!!!

ہاں مگر دیکھ لو ذرا ہمارے حوصلے بھی، تمھیں کہاں کہاں یاد کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ تمھاری بارات جانے کس مقدر والے کے گھر اُترے گی...... مگر تمھاری یادوں کی بارات تو اس وقت سامنے ہے۔ میں اس کے ہجوم میں تنہا بیٹھا...... کیا کیا سوچ رہا ہوں، اپنا دل بھی ایک دیوانہ ہے۔ جانتا ہے تم وہ شبنم ہو، جس نے صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اُڑ جانا ہے۔ سمجھتا ہے کل کتنا خوفناک ہوگا۔ پھر بھی تمھارے لیے جیئے جاتا ہے۔

اب کی بار ایک بات بُری بھی ہوئی...... میری ماں مجھ سے ناراض ہو گئی۔ کتنی سادہ ہے، کہتی تھی امتحانوں کے بعد وہ 'خوشی' دیکھنا چاہتی ہے۔ مگر میرے پاس خوشی ایسی چیز کہاں ہے، جو اُسے دوں۔ میں تو اپنا سب کچھ تمھارے حوالے کر چکا ہوں۔ تم دونوں اپنے اپنے مقام پر اتنی سخت کیوں ہو؟ جانے کیوں رُوٹھ جاتی ہو؟ ایک خوشیاں مانگ رہی ہے...... دوسری چھین رہی ہے۔ تم ہی بتاؤ،

میں کیا کروں؟ تم دونوں میں سے...... کسے چھوڑوں؟ اور کیسے؟......اور چھوڑ کر پھر زندہ کس طرح رہوں؟ تم ہو کہ اپنا گھر بسانا چاہتی ہو، وہ ہے کہ اپنے بیٹے کا گھر بسانا چاہتی ہے۔ مگر کاش تم دونوں ایک ہی طرح سوچتیں۔

تمھارے لیے ایک سوٹ لیا ہے۔ اچھا رنگ ہے۔ مجھے رنگوں کے نام نہیں آتے......شاید پنک ہے۔ مردانہ قمیض بنانا بہت سجے گی۔ دیکھوں 'چیٹو' بہت بور ہو رہا ہے، بار بار گھر چلنے کا اصرار کر رہا ہے......اجازت دو۔

بہت سا پیار

۲۰/جنوری ۱۹۷۳ء
کلر سیداں (درکالی شیر شاہی)

دیوی جی

خط ملا، واقعی زلفِ یار کی طرح دراز تھا۔ ہاں مگر اُس کی طرح بل کھایا ہوا نہ تھا، بالکل سیدھا سادا سا تھا۔ تم نے کہا تھا، تم جذباتی خط نہیں لکھ سکتیں...... خرم کو بھی ایسے ہی خط لکھتی ہو، سو جناب نے اس خط میں اپنی یہ بات پوری طرح نبھائی ہے...... ویسے اچھا ہے، بل کھانا یوں بھی اِس بات کی نشانی ہوا کرتا ہے کہ کوئی سیدھا کر دے۔ اِس سے تو کہیں بہتر ہے آدمی پہلے ہی سیدھا رہے، ورنہ ہماری حالت دیکھ لیجئے۔ کانچ کے اَن گنت ٹکڑوں کی طرح فرش پر بکھرے پڑے ہیں۔ جلی راکھ کی مانند فضا میں اُڑ رہے ہیں۔ آپ ایسے سمجھ دار لوگوں کو عبرت پکڑنی چاہیے...... اور بل کھانے سے پرہیز ہی کرنا چاہیے۔

پورے سات دن بیت گئے۔ تمھاری آواز کے ترنم سے محروم اور تمھاری سانسوں کی مہک سے دُور بیٹھا ہوں۔ میرا خیال تھا، شاید گاؤں میں رہ کر امتحان کی تیاری کر پاؤں۔ وائے مگر یہ خیال حقیقت بنتا نظر نہیں آ رہا...... ایک ہفتے سے تنہا کمرے میں بند ہوں، لیکن اِن سارے دنوں میں سات صفحے بھی نہ پڑھ پایا ہوں گا۔ اِدھر میں نے کتاب کھولی، اُدھر تمھاری تصویر آنکھوں کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ کوئی کیسے پڑھے؟ ابھی کچھ دیر قبل شہناز (میری بھتیجی) نے تمھارا خط مجھے دیا۔ میں پڑھنے لگا اور وہ قریب ہی بیٹھ گئی۔ شاید جاننا چاہتی تھی، خط کس کا ہے؟ آخر اُس نے پوچھ ہی لیا، میں نے کہا ''اپنی دوست کا......'' اور وہ باہر چلی گئی۔

باہر صحن میں بچوں نے اِس وقت ایک اُدھم مچا رکھا ہے۔ سکول سے آج چھٹی پر ہیں۔ صبح ہی سے کھیلتے ہوئے چھوٹی چھوٹی باتوں پر اُلجھ بھی رہے ہیں۔ خط لکھتے لکھتے قلم رکھنا پڑتا ہے کہ فریقین ایک دوسرے کے خلاف احتجاجی مراسلے لیے میرے پاس آن پہنچے ہیں۔ فریقین کے دلائل سننے

کے بعد سکیورٹی کونسل کی طرح امن کا بھاشن دیتا ہوں۔ متنازع گیند کو بین الاقوامی ملکیت قرار دیتے ہوئے، جارحیت کرنے والے کی زبانی سرزنش کرتا ہوں، معاہدہ امن طے پاتا ہے۔ فریقین دوبارہ باہر نکلتے ہیں۔ مگر دوسرے لمحے پھر جنگ کے بادل چھا جاتے ہیں۔

جان لو۔ بچوں سے لے کر بڑوں تک...... افراد سے لے کر اقوام تک...... سبھی جھگڑے 'میرے اور تیرے' کے پیدا کردہ ہیں۔ یہ میرا، تیرا، اگر 'ہمارے' میں بدل جائے تو شاید فساد ختم ہو پائیں۔

میں جلد ہی یونیورسٹی واپس آنے کا پروگرام بنا رہا ہوں۔ آپ سے دُور...... زندہ رہنا ہی بہت مشکل ہو رہا ہے، پڑھنے کی بات تو خیر بعد کی ہے۔ امتحان سر پر ہیں...... پورے دو سال میں قسم لے لو جو کبھی کلاس روم کا منہ دیکھا، پہلے سیاست ہوتی رہی پھر تم نے دل و دماغ کے سوتوں پر آن قبضہ کیا۔ سچ جانو، مجھے پاس ہونے کی بالکل اُمید نہیں ہے۔ تم جانے کیسے دو دو کام کر لیتی ہو، ہم تو ایک وقت میں صرف ایک ہی کام کر سکتے ہیں اور پھر اس امتحان کی مجھے فکر بھی نہیں۔ تمھارے والے ہی میں پاس ہو جاؤں تو سمجھوں گا کہ...... میں جیت گیا۔

ایک تو تم بڑے لوگوں کے بنائے ہوئے پرچے بہت سخت اور ہم ایسے لوگوں کے لیے تقریباً 'آؤٹ آف کورس' ہوتے ہیں۔ اِس پرچے کا پہلا لازمی سوال ہی یہ ہوتا ہے کہ اُمیدوار سی ایس پی ہے یا نہیں...... اگر پرچہ آسان بنایا جائے اور دوسرے کچھ گیس بھی لگوا دیا جائے، تو کام ہو سکتا ہے۔ ورنہ میں نے دونوں امتحانوں میں فیل ہو جانا ہے۔ تمھارے بغیر شاید زندہ تو رہ پاؤں گا مگر جانے کیوں کر۔

تم نے بار بار لکھا ہے کہ میں امتحان کی تیاری کروں۔ چلو وعدہ کرو، تم مجھے چھوڑ کر کبھی نہ جاؤ گی۔ تو میں، تمھیں آج ہی...... لکھ دیتا ہوں کہ میں...... فرسٹ ڈویژن لوں گا۔ اگر نہ لے سکوں تو تم مجھے چھوڑ جانا۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں تا کہ تمھیں پتہ چلے، میں اگر فیل ہو رہا ہوں تو اس کی وجہ میری کند ذہنی نہیں...... بلکہ تم ہو۔ امتحان میں صرف چند ہفتے باقی ہیں...... وعدہ کر لو...... پھر فرسٹ ڈویژن نہ آئے تو گولی مار دینا۔ ورنہ تم نے اتنی اُداسیاں دے رکھی ہیں کہ ذہن پر ہتھوڑے برستے رہتے ہیں۔ ایسے میں کوئی کیا پڑھے...... اور کیا لکھے؟ تم مستقبل کی تاریکیوں کا خوف ختم

کر سکتی ہو۔ صرف تم ہی مجھے بچا سکتی ہو...... صرف تم۔

یونیورسٹی کے کیا حال چال ہیں؟ تمھارے امتحان تو اب ختم ہونے والے ہوں گے؟ گلشن کا کوئی خط وغیرہ آیا ہے یا نہیں؟ صبیحہ کے کان کھینچ دینا۔

شاید خط کے ملنے تک میں بھی واپس آجاؤں۔

بہت سا پیار...... تمھارا ہمیشہ......

۲۴/ جنوری ۱۹۷۳ء
۱۲۹۔ سرسید ہال
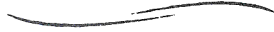
رانی

میں گاؤں سے واپسی پر بہت خوش خوش چلا کہ تمھارے درشن ہوں گے...... پنڈی سے لاہور کا مختصر سا سفر مجھے صدیوں سے زیادہ طویل لگا۔ کئی بار محسوس ہوا جیسے بس رینگ رینگ کر چل رہی ہو...... جانے منزل پر پہنچے گی یا......؟ میں نے اِس اذیت سے بچنے کے لیے بس کی اگلی سیٹ پر سر جھکایا......اور آنکھیں بند کر کے...... تمھارے خیالوں میں گم ہو گیا۔ جذبات کی متلاطم لہریں، حسین یادوں کے ساتھ، اُبھرتی ڈوبتی اور مچلتی رہیں۔ احساسات کے آتشیں تانت پر گاہے جسم دھنکتا اور گاہے پگھلتا رہا۔ سوچا جب تم سے ملوں گا، تو تمھارے منہ سے پہلا لفظ کیا نکلے گا؟ وہ آ گئے......نہیں شاید یہ کہو ''راجہ صاحب آ گئے۔'' تم مجھے ہمیشہ راجہ صاحب ہی کہا کرتی ہو اور پھر جب کوئی دوسرا...... مجھے اِس طرح بلاتا ہے تو سچ جانو مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا......ایک اور ہچکولا آیا......جب تم ملوگی......تو کیوں نہ سبھی کے سامنے تمھیں سینے سے لگا لوں......لوگ بُرا مناتے ہیں مناتے پھریں۔ میرا کیا بگاڑ لیں گے۔

کوئی گیارہ بجے ہاسٹل پہنچا۔ سامان کمرے میں پھینک کر تمھارے ڈیپارٹمنٹ کی جانب دوڑا، مگر تم نہ تھیں۔ شبیر ملک نے بتایا کہ صبح تم کیفے ٹیریا میں بیٹھی تھیں۔ وہاں پہنچا تو 'فل سائز' جیسے میرا ہی منتظر بیٹھا تھا۔ بھاگا بھاگا آیا اور پہلی ہی خبر یہ سنائی ''وہ تو خرم صاحب کے ساتھ کہیں شہر گئی ہے۔'' غریب نے بڑے دُکھ سے آہ بھری۔ ایک تو وہ پہلے ہی دیوانہ تھا اُوپر سے تم پر عاشق بھی ہو گیا۔ اب مت ہی ہوا ٹھیک۔ یہاں تو فرزانے، دیوانے ہو جاتے ہیں۔ اُس کا کیا بنے گا؟ ویسے بعض لڑکے بہت ذلیل ہیں۔ اُس بے چارے کو اتنا تنگ کرتے ہیں۔ آج اُس سے کیفے ٹیریا میں ڈانس کروا رہے تھے۔ اتنے دنوں بعد، میں اُس کے قابو چڑھا تھا۔ اُس نے

تمھارے اور اپنے 'عشق' کے ڈھیر سارے قصے سنائے۔ پھر وہ خط زبانی سنایا...... جو اُس نے تمھیں لکھا تھا۔ کہہ رہا تھا، اس نے تمھارے لیے کوئی تحفہ خرید رکھا ہے۔ مجھے اس کی یہ ادا بہت پسند ہے۔ جب وہ تمھیں دیکھ کر بڑے ہی سوز اور گہرائی سے 'اللہ' کا نعرہ لگایا کرتا ہے۔ اس لمحے یوں لگتا ہے، جیسے واقعی اللہ سامنے آ گیا ہے...... اُس کا بھی کیا قصور یہاں تو اچھے اچھوں کو خدا یاد آ جاتا ہے۔

ابھی کیفے ٹیریا سے اُٹھنا ہی چاہتا تھا کہ عطی، عارف، راجہ اور بانو آ گئے۔ اُن کے ساتھ پھر چائے چلی۔ آخر میں نے عطی سے پوچھ ہی لیا۔ ''لوگ کس حال میں ہیں؟'' سبھی زیرِ لب مسکرا دیے۔ عطی بھلا ایسا موقع ضائع جانے دیتا۔ فوراً بولا ''کون سے لوگ؟...... نام لو تو پتہ چلے...... یونیورسٹی تو لوگوں سے بھری پڑی ہے۔'' قہقہہ برسا اور مجھے بھی مجبوراً ساتھ دینا پڑا۔

ناز! نسیم الرحمٰن کو لیے ایک کونے میں دبکی تھی...... دیکھ لو پھر ہماری پیغمبری بھی...... ہم نے بہت پہلے 'پیش گوئی' کر دی تھی۔ اب تو تمھیں یقین آیا کہ چکر چل رہا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگ بہت سادہ سہی...... مگر باتیں کام کی بھی کہہ جایا کرتے تھے۔ کہاوت ہے نا، عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے...... اب خواہ دیکھ لیجیے یا سونگھ لیجیے۔ ہماری بات سچ نکلے گی۔ اپنی طرف سے وہ 'بدلہ' لے رہی ہے۔ سوچتی ہوگی، اِس طرح شاید میں اُس کے چکر میں پھر آ جاؤں۔ جب واسطہ ہی ٹوٹ گیا، تو مجھے دُکھ کیوں ہوگا۔ میں جانتا ہوں وہ صرف عورت ہے۔ ایک افیونی عورت، جسے ہر لمحہ مرد چاہیے۔ بے چاری بدقسمت ہے کہ اسے ہمیشہ ہم ایسے 'پھوکٹ' مرد ہی ملے، جن سے ذائقہ تو بدل سکتا ہے۔ لیکن زندگی نہیں بدل سکتی......

شام، ہاسٹل بھی گیا...... مگر تمھارے 'دربان' نے نہایت عاجزی سے سر ہلا دیا۔ تم شاید امی کے ساتھ گئی ہوئی تھیں۔ تمھارا دربان، بہت تیز تیز نظروں سے مجھے دیکھتا ہے۔ سوچتا ہوگا، ایک طرف کار چکر لگا رہی ہے اور دوسری طرف یہ شخص۔ تم لڑکیوں کے چوکیدار تو پورے پورے وزیرِ داخلہ ہوتے ہیں...... اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں...... ویسے ایک بات ہے۔ اس آدمی کی آنکھوں سے...... تو مجھے ہر بار یہی محسوس ہوتا ہے، جیسے کہہ رہا ہو...... تم...... تم کیوں خراب ہونا چاہتے ہو؟...... دیکھ لو وہ بھی حقیقت جان گیا ہے! شاید، ہم غریب لوگ ایک دوسرے کی غربت

سونگھ لیتے ہیں...... کار میں بیٹھ جائیں تو بھی نظر آجاتا ہے جیسے کار سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ اچھے کپڑے پہن لیں...... تب بھی ہمارے جسم سے افلاس کے اندھیرے پھوٹتے رہتے ہیں۔ کسی اچھی عورت کے ساتھ ہوں تو جچتے نہیں......

ڈھیروں پیار

۲۸/ جنوری ۱۹۷۳ء

۱۲۹۔ سر سید ہال

رانی

کیوں، پھر کیسا تھا؟ تم نے کہا تھا ''مجھے اچھے لگو گے تب بھی نہ بتاؤں گی اور بُرے لگے جب بھی''۔ تم نے تو دل پر پتھر رکھا ہوا تھا۔ اُس 'شخص' کو ہر دوسرے روز خط لکھا جاتا تھا۔ ہمیں ہفتے میں صرف ایک بار قدم چومنے کی اجازت...... کیفے ٹیریا تک بھی گھسیٹ کر لے جانا پڑتا تھا۔ وہ آجائے تو ہم پہروں ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب...... ہاسٹل کے طواف کھینچتے پھریں، مادام کو مگر ہماری پرواہی نہ ہوتی تھی...... کل شام ہم اکٹھے تھے...... تم نے باتوں ہی باتوں میں بتایا تھا۔ ''خرم تمھارے پیر صاحب سے بھی ملے ہیں اور پیر صاحب رشتے کے لیے تمھارے ڈیڈی سے کہیں گے۔'' حالانکہ تم نے مجھ سے پرسوں خان والے کھوکھے پر وعدہ کیا تھا کہ تم میرے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار ہو، صرف میں ذرا سا 'شریف' بن جاؤں تاکہ اس میں گھر والوں سے کوئی بات ہو سکے......

جانتی ہو، ساری گڑبڑ اسی فوٹو نے کرائی ہے، جو کل میرے پاس رہ گیا تھا۔ جناب نے ساڑھی پہن رکھی تھی...... ماتھے پہ ٹیکا، دلہن سی بنی افسر کے ساتھ شرمائی لجائی کھڑی تھی۔

میں نے سوچا، تمھیں اگر یہ احساس دلایا جائے کہ میں تمھارے علاوہ بھی کسی لڑکی سے ملتا ہوں، اسے خط لکھتا ہوں، اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں...... اور تمھیں صرف فلرٹ کر رہا ہوں، تو شاید دُکھ کی اِس شدید کیفیت کو محسوس کر پاؤ جس سے تم مجھے گزار رہی ہو۔ چنانچہ میں نے اُس 'لڑکی' کے نام خط لکھا...... اور تم تک پہنچا دیا۔ اِس طرح کہ تم سمجھو، میں نے غلطی سے تمھیں دے دیا ہے...... اور تم نے خط پڑھتے ہی رونا شروع کر دیا۔ دیکھا تم نے جب پتہ چلے دوسرا صرف کھیل رہا ہے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے؟

ایک بات اچھی ہوئی۔ تمھارے لگائے ہوئے سارے بند ٹوٹ گئے۔ تم نے غصے کے عالم میں اَن گنت بار کہا کہ تمھیں مجھ سے بہت پیار 'تھا'۔ لیڈیز ہاسٹل کے باہر، جب تم غصے میں روتی ہوئی مجھ سے لڑ رہی تھیں، تو پتہ ہے تمھیں وہیں چوم لینے کو جی چاہتا تھا۔ مت پوچھو، میں نے کتنی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔

ذرا اپنے دل کی گہرائی میں جھانکو، کہیں کوئی چنگاری جل رہی ہے...... جسے تم ہر لمحہ بجھانے کے درپے رہتی ہو...... مگر یہ چنگاری اب آسانی سے بجھ نہ پائے گی میری سرکار۔ یونہی ہوتا چلا آرہا ہے، میرے ساتھ بھی تو یہی ہوا تھا۔

وہ جو چند گھنٹے تکلیف ہوئی اس کے لیے معاف کرنا، بعد میں کیا خوشی نہیں ہوئی؟ جب اصل بات کا پتہ چلا...... کہ میں نے تو صرف سنجیدہ سا مذاق کیا تھا...... تم روتے روتے کتنے پیار سے مسکرا دی تھیں۔ مجھے تمھاری مجبوریوں کا علم ہے۔ مجھے پتہ ہے تم بھی ان دنوں بہت پریشان ہو۔ ایک جانب گھر والے...... دوسری جانب 'وہ شخص'، جس کے حوالے سے تمھیں ساری یونیورسٹی جانتی ہے...... تیسری جانب میں ہوں، جس سے تمھیں چاہت بھی ہے...... جسے بھلا دینا اب تمھارے بس سے باہر نظر آتا ہے...... تم کنفیوز ہو کہ کیا کرو، کسے رکھو اور کسے چھوڑو؟ میں تم سے لڑتا رہتا ہوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں تم پر اعتماد نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے تم میری بنو نہ بنو میری دیوانگی کو کبھی بھی بھلا نہ سکو گی۔

ایک تو میں بہت دیر بعد دوڑا...... اور دوسرے میرا مقابلہ نئے ماڈل کی خوبصورت کار سے ہے۔ میں مانتا ہوں، میں ہار جاؤں گا۔ آخر انسان ہوں مشین سے کیسے مقابلہ کروں؟...... پیار کے میدان میں 'وہ شخص' مجھ سے شکست کھا چکا ہے۔ ورنہ اُس کے ہوتے ہوئے تم مجھے کیوں ملتیں؟

کل کیا ہوگا۔ کون جانے؟ آؤ آج کی بات کریں۔ اب تو صرف چند مہینوں کی مہلت باقی ہے۔ پھر ہم نے یہاں سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ ہی جانا ہے...... اِس سے پہلے کہ زمانے کا سیلاب زندگی کے موجودہ لمحات کو بہالے جائے مجھے اپنے دل کی دھڑکنوں کے درمیان سکون سے سانس لینے دو۔ اتنا قریب کہ تمھارے جسم کی خوشبو میرے اندر اُتر جائے۔ اتنا پیار...... کہ میری سسکتی خواہشات کو قرار آجائے۔ اتنے سانس میرے اندر داخل کر دیجیے کہ میرے پھیپھڑے عمر

بھراس مہک سے آشنا رہیں۔ میرے جسم پر اپنی مخروطی اُنگلیاں اتنی بار پھیرو کہ لطیف جذبات کے دباؤ سے میرا گرم خون پھٹ کر باہر آجائے۔ میں کچھ زیادہ تو نہیں مانگ رہا تم ہی فیصلہ کرو کیا یہ زیادہ ہے اُن آہوں کے مقابلے میں جو میں نے تمھارے لیے بھریں۔ اُن اذیت ناک لمحات کے معاوضے میں، جو میں نے تمھارے انتظار کی آگ میں جلائے۔ اُن دنوں کے صلے میں، جو میں نے تمھارے سائے کی تلاش میں بکھیر دیئے۔ ان راتوں کے بدلے میں جو میں نے جاگ جاگ کر گزار دیں...... یا پھر غم کی اس چتا کے مقابلے میں جہاں...... میں نے آئندہ بھی جلنا ہے...... اور جلتے ہی رہنا ہے۔

ہاں تو اس دن جماعت اسلامی والوں کا لکچر کیسا تھا؟ کہہ رہے تھے ''خدا غریبوں کو پسند کرتا ہے۔ انھیں اگلے جہاں جنت دے گا۔ غربت تو صرف آزمائش ہے۔'' بعد میں میں نے اُن صاحب سے کہا تھا ''ہم کب کہتے ہیں کہ خدا غریبوں کے ساتھ نہیں۔ اگر جنت کا کوئی وجود ہے تو یقیناً اس میں غریب ہی جائیں گے۔ لیکن ہم امیروں کی مانند حاسد نہیں۔ ہم انھیں بھی اپنے ساتھ جنت میں لے جانا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم انھیں دولت سے نجات دلا کر جنت کا حق دار بنانا چاہتے ہیں۔ آپ ان کی دولت بچا کر انھیں کیوں دوزخی کرنے پر بضد ہیں۔''

ان لوگوں کا اصل مسئلہ جنت ہے نہ دوزخ۔ یہ یہاں ہی چار چار بیویاں اور اَن گنت کنیزیں رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ اپنی زندگی کو جنت نظیر بنانا چاہتے ہیں لیکن ہم بات کریں تو وعدہ حور پر ٹال دیتے ہیں۔ اصل مقصد دولت کی حفاظت ہے۔ یہ جتنے امیروں کے وفادار ہیں، اگر اتنے خدا کے ہوتے، تو آج دنیا بدل چکی ہوتی۔

پرسوں رات کا پروگرام بن جائے...... یاد ہے نا کبھی وعدہ ہوا تھا؟ امی تو آچکیں، اب نبھا دیجئے۔ میری چھاتی پر سر رکھ کر سو جانا۔ یہ بھی بہت زیادہ ہے!

ڈھیروں پیار کے ساتھ

۵/فروری ۱۹۷۳ء

۱۲۹۔ سرسید ہال

کنول

بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی 'گھر سے سخت خط آ گیا ہے'' ''لوگ باتیں بناتے ہیں'' ''پتہ نہیں کیا ہوگا؟'' یہ سب اوٹ پٹانگ سوچ کر خود پریشان ہوتی پھرو اور مجھے بھی پریشان کرو۔ مجھے تو تمھاری یہ پریشانی فضول لگتی ہے۔ لوگ تو پھر لوگ ہیں، خدا کو بھی نہیں چھوڑتے ہمیں کہاں معاف کریں گے؟ مگر اُن سے ڈرنا نہیں چاہیے، جو ڈر گیا جان لو مر گیا۔

کوئی ہم سا آدمی فکر مند ہو تو ایک بات بھی ہے۔ دیکھ لو، تمھارے بغیر اگر زندہ رہنا پڑا تو شاید پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو کر زندگی گزارنا پڑے گی...... پھر بھی تمھارے سامنے ہمہ وقت ہنستے مسکراتے پھرتے ہیں۔

تمھیں یہ تو سوچنا چاہیے کہ کچھ لوگ تمھاری مسکراہٹ سے زندگی لیتے ہیں۔ تم جو سر پکڑ کر بیٹھ جاؤ، تو پھر اُن کا کیا حشر ہوگا؟ کبھی انسان کو دوسروں کے لیے مسکرانا پڑتا ہے اور کبھی رونا۔ یہ دونوں کام اپنی اپنی صورتِ حال کے حوالے سے جائز ہیں۔ چلیئے...... اب مسکرا دیجیے۔

مجھے پتہ ہے 'صاحب' سے تمھارے سلسلے کی بھنک گھر تک پہنچی ہوگی۔ جبھی تمھاری بہن نے احتیاطاً خط لکھ دیا ہے۔ وہ شریف آدمی تو اب یہاں ہے نہیں، مگر اُس کی دی ہوئی پریشانیوں کا دُکھ بھی ہمی کو اُٹھانا پڑتا ہے۔

مگر تم 'اعتکاف' سے باہر تو آؤ۔ جو ہونا تھا، اس میں سے بہت کچھ ہو چکا، باقی نے ہو جانا ہے، پھر یوں رونے دھونے سے فائدہ؟ میں پیغمبر تو نہیں، پر تم میری ایک بات لکھ لو۔ تمھاری شادی بہر حال 'اُسی' خوش نصیب سے ہونی ہے۔

تمھارے کزن کو تم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ رہ گیا میں، بھلا مجھے کس نے پوچھنا ہے؟ ارے

بھائی، میں تو وہ گردِ کارواں ہوں جسے لوگ منزل پر پہنچنے سے قبل ہی جھاڑ دیا کرتے ہیں۔

پرسوں صبح ہم لوگ اسمبلی ہال کے باہر مظاہرہ کرنے جا رہے ہیں۔ روبیہ تمھیں ساری تفصیلات بتا دے گی۔ دراصل یہ اُسی کا بندوبست ہے۔ شہر میں کوئی فیکٹری ہے۔ جہاں مزدور خواتین سے بُرا سلوک کیا جاتا ہے۔ اِس لڑکی روبیہ کا حوصلہ دیکھو اُس نے حقیقت حال کو کھوج لگانے کے لیے چند دن وہاں ملازمت بھی کی۔ مظاہرے پر بہت سی لڑکیاں جا رہی ہیں۔ تم شاہدہ ملک کو بھی لیتی چلنا۔ اُس نے یوں بھی ہر روز آنکھیں دکھانے ای۔ پلومر (E-Plomer) والوں کے پاس جانا ہوتا ہے۔ بارہ بجے تک جلوس سے فارغ ہو کر ای۔ پلومر چلے چلیں گے۔ شاہدہ آنکھیں دکھائے گی اور ہم وہیں سے...... کسی نئی فلم پر پھوٹ لیں گے۔

یاد آیا 'دی کوئینز' کیسی تھی؟ مجھے تو بہت اچھی لگی۔ فلم کے آخری حصے میں تو بالکل ہم دونوں کی سی سچوائشن ہے۔ بڑے آدمی کی بیوی نشے میں بہک کر اپنے نوکر کو ساتھ سلا لیتی ہے مگر صبح اُسے پہچاننے سے انکار کر دیتی ہے۔ کئی بار یوں ہی ہوتا ہے...... فلم دیکھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا۔ تم نے کبھی پہچاننے سے انکار کر دیا تو؟...... ہاں مگر یاد رکھنا وہاں سے سٹوری بدل جائے گی...... کیوں کہ میں ذرا بگڑا ہوا نوکر ہوں...... دھیان ہی رکھنا۔ تم نے کہا تھا کوئی لڑکی نبیلہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں تو اُسے جانتا نہیں، کیسی چیز ہے؟...... اور کیوں ملنا چاہتی ہے؟ اُسے بتانا، لوگ تو بڑے آدمیوں سے ملا کرتے ہیں۔ میں ایک چھوٹا انسان ہوں۔ مجھے مل کر اُسے کیا فائدہ ہوگا؟

صبیحہ بہت تنگ کرتی ہے۔ ذرا اُس کے کان کھینچ دیا کرو۔ یا اُس کا کوئی 'بندوبست' کرو۔ یہ لڑکیاں، ورنہ اِسی طرح لڑکیاں ہی رہتی ہیں۔ عورتیں نہیں بنتیں......

'سنتوش' سے آج کل کیا بگڑ گئی ہے؟ تمھاری موجودگی میں وہ کھل کر بات نہیں کرتی اور ہاں برقعے والی احمدی لڑکی سے کہنا، میں 'خدا کے وجود' پر بحث نہیں کرتا۔ خدا کو ثابت کرنے کی بجائے اُسے مان لینا چاہیے۔ اپنے اپنے عقیدے کی بات ہے۔ دل کی گہرائیوں سے 'ہاں' کی آواز اُٹھے، تو بس کافی جانو۔ میں نے کسی سے سنا تھا۔ وہ مجھ سے اس سلسلے میں بحث کرنا چاہتی ہے۔

...... کمر میں جانے کیوں شدید تکلیف ہو رہی ہے۔

اب اجازت دیجیے۔

یکم مارچ ۱۹۷۳ء

دیوی

پھر پسند آیا طارق عزیز؟ کل رات اُس کی فلم کے سیٹ پر جب تم نے میرا ہاتھ تھاما۔ تو وہ میری جانب دیکھ کر خوشی سے مسکرا دیا تھا۔ آدمی بہت پیارا ہے۔ جو کبھی ہم سفر نہ تھے، کہاں سے کہاں پہنچے۔ وہ ہے کہ اپنی ہی طرح مارا مارا پھر رہا ہے۔ یحیٰی خان کے دور میں اُس کو سزا ہوگئی وہ فلمی دنیا کی 'جنت' سے چل کر جیل کے 'دوزخ' میں آن پہنچا۔ بے چارہ اپنے ساتھ ہی 'سی کلاس' میں تھا۔ مگر اُس کا سر نہ جھکا...... یہ اُس کی انانیت تھی۔ دوسری جانب اُس کی انسانیت دیکھو کہ ایک مرتبہ چندہ لینے 'اُس بازار' میں گیا۔ کسی طوائف نے ساری پونجی اُس کے حوالے کر دی۔ طارق نے بھرے بازار میں اُس کے پاؤں چوم لیے۔ ایک دفعہ میں نے اُس کے ساتھ انتہائی غلط سلوک کیا۔ جب ملا تو اُس نے شکوہ کرنے کی بجائے اپنے سمندر جیسے فراخ دامن میں مجھے یوں سمیٹ لیا جیسے وہ صدیوں سے میرا ہی منتظر تھا۔

ہاں شاہدہ ملک نے آج شام یونیورسٹی سے چلے جانا تھا۔ دن کو میں اس سے ملا تھا۔ سچ پوچھو، تو اُس کے جانے کا مجھے بہت دُکھ ہے۔ تم اسٹیشن تک اُسے خدا حافظ کہنے گئی ہوگی؟ مجھے بھی آنے کو کہہ رہی تھی مگر میں نے اُسے بتایا کہ میں دوستوں کو جاتے ہوئے......اور انسانوں کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ بعد میں یہی منظر آنکھوں کے سامنے پھرتا رہتا ہے......اچھی لڑکی تھی۔ اُسے خدا کبھی دُکھ نہ دے۔ اُس کے بغیر ہاسٹل تمھیں بھی سُونا سُونا لگتا ہوگا اور بقول تمھارے 'ظاہری بات ہے'۔

سنو تمھارا 'صاحب' ٹھیک ہی کہتا ہے، واقعی ہم بھی کیا ناکارہ لوگ ہیں دن بھر چائے پیتے ہیں، سگریٹ پھونکتے ہیں......اور انقلاب کے نعروں...سے، جامعہ کے 'شاہین' بچوں اور بچیوں کے

سکون میں مُخل ہوتے ہیں......

اگر کبھی موقع بنے تو اُسے میری جانب سے کہہ دینا۔ تاریخ کوئی حسین دوشیزہ نہیں، جسے نئے ماڈل کی کار کے ذریعے فتح کیا جاسکے۔ اُس نے آج جو زندگی اپنا رکھی ہے...... میں نے اُسے رد کر دیا تھا۔ اور کل یہ بات اِس کے برعکس بھی ہوسکتی ہے۔ یہ ممکن ہے، اُس جیسے 'حادثاتی بڑے' کسی زمانے میں بونے قرار دے دیئے جائیں اور اگر اُسے اپنے بڑے ہونے کا واقعی شک ہے تو اُسے کہو، دنیا کے کسی میدان میں میرے ساتھ مقابلہ کر دیکھے...... (سوائے تمھارے)

میں نئے دور کا نیا انسان ہوں۔ میں مردانہ رقابتوں کا قائل نہیں۔ میں نے بچپن میں اکثر دیکھا ہے کہ جنس کے معاملے میں طاقتور بیل، اپنے سے کمزور کو ہمیشہ مار بھگاتا ہے۔ تنومند کتا دوسروں کو بچھاڑنے کے بعد، جنس سے متمتع ہوتا ہے اور ہمارے سماج میں دولت والا...... اِسی طرح دوسروں سے یہ حق چھینتا ہے...... میں بیل نہیں بننا چاہتا۔ میرے پاس شعور کی لازوال رفعتیں ہیں۔ میں انسان ہوں...... اور عظمتیں میری خاکِ پا سے جنم لیتی ہیں۔ میرے نزدیک عورت اپنے گداز سینے، سفید رانوں...... اور اُبھری چھاتیوں سے علاوہ بھی کچھ ہے اور وہ یہ کہ انسان ہے۔ محبت اور جنس (Sex Love and)...... درحقیقت ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ جنس کے بغیر محبت کی حیثیت دیوانے کے خواب کی سی ہے اور محبت کے بغیر جنس، محض خود لذتی ہے۔ ہمارے یہاں جنس کو شادی سے وابستہ کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ شادی تو دو انسانوں کے درمیان محض ایک سماجی معاہدے کا نام ہے۔ ایک طرح کا معاشی تحفظ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں تم عورتوں کو جنس سے نفرت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ مردوں سے خوف زدہ کیا جاتا ہے...... دیکھو نا تم خُرم سے ملتی تھیں۔ اُس کے بعد مجھ سے ملیں، اِس کی کیا وجہ ہے؟ آخر کسی عورت سے تمھارا افیئر کیوں نہ ہوا...... پھر اگر ہم دونوں میں سے کوئی تمھیں بتادے کہ وہ مردانہ اوصاف ہی نہیں رکھتا...... تم اسے درمیانی جنس جان کر دوسرے لمحے ہی چھوڑ جاؤ گی۔ ہم مانیں یا نہ مانیں عورتیں اور مرد کے مابین محبت کی تہ میں جنس کا رُجحان پورے طریقے سے موجود ہوتا ہے۔ جسے ہم اپنی معاشرتی اقدار کے خوف سے...... لاشعور میں دھکیل دیتے ہیں۔ میں تمھیں دلچسپ بات بتاؤں کہ جنسی لذت...... کا تعلق ایک جانب تو جسم سے ہے اور دوسری جانب ذہن سے...... دونوں پہلوؤں کی تکمیل ضروری

ہے۔ ورنہ ...... جنسی ملاپ کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انسان آسمانوں کی بلندیوں سے ...... زمین پر آن گرا ہو۔ لٰہذا میرے نزدیک دنیا کا سب سے بڑا گناہ ...... کسی عورت کے ساتھ زبردستی سونا ہے۔ تم تو میرے ساتھ راتوں کو باہر رہی ہو۔ کیا میں نے تمھیں کبھی یہ محسوس ہونے دیا کہ میں صرف مرد ہوں، جب تک اندر کی چاہت ...... جسم کی چاہت کے ساتھ ساتھ نہ اُبھرے، میں کسی عورت کے ساتھ سو نہیں سکتا اور اندر کی چاہت کے لیے لازم ہے کہ ...... باہمی پسندیدگی ہو اور ایک دوسرے سے گہری شناسائی ہو۔ کیونکہ میرے نزدیک عورت سے ملنا ...... ایک مقدس فعل ہے۔ اب اِن مَردوں کی نفسیات دیکھو، سمجھتے ہیں، اُن کا کام تو صرف سونا ہے اور بس ...... ہر راہ چلتی متناسب عورت کو کھانے دوڑتے ہیں۔ چونکہ اُنھیں سماجی برتری حاصل ہے اس لیے اُن کی اپنی عصمت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ عزت، وقار، غیرت اور حیا جیسے تمام لغو تصورات انھوں نے تم عورتوں کی دم کے ساتھ باندھ رکھے ہیں۔ اِن مَردوں کو کون سمجھائے ...... اگر حیا واقعی کوئی شے ہے تو پھر دونوں اصناف کے لیے ہونی چاہیے۔ انھیں کون بتائے کہ جب وہ عورت کے ساتھ سوتے ہیں تو ...... اپنی بھی عصمت دری کر رہے ہوتے ہیں۔

تم نے دیکھا نہیں شادی شدہ مرد بھی دوسری عورتوں کے پیچھے بھاگے پھرتے ہیں۔ میرا خیال ہے اِس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ جنس کو صرف سفید رانوں تک محدود سمجھتے ہیں۔ چنانچہ زیادہ سے زیادہ رانیں اکٹھی کرنے کے لیے دوڑتے دوڑتے زندگی سے گزر جاتے ہیں۔ وہ جنسی ملاپ کے ذہنی پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں، اِس لیے ذہن کی بھوک کو بھی ...... جسم کے گوشت سے پورا کرنے کی سعی ناکام میں، ایک کے بعد دوسری ...... پھر تیسری ...... کی تلاش میں مصروف رہتے ہیں۔ جنسی ملاپ تو ایک تخلیقی امر ہے ...... ہمارے لوگ اس کو میکانکی انداز میں سرانجام دیتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ بیوی خاوند ...... ملتے تو ایک دوسرے سے ہیں لیکن آنکھیں بند کر کے، ہر روز نئی عورت اور نئے مرد کو فرض کرتے ہیں ......

اور سنو، انڈونیشیا میں ایک قبیلہ ہے۔ جہاں عورت خاندان کی سربراہ ہے۔ مرد دلہن بنتے ہیں۔ وہاں عورتیں مرد کو 'پھنسانے' کے لیے اِسی طرح دوڑتی ہیں جیسے تم لوگوں کا تعاقب مرد کرتے ہیں۔ اُس قبیلے کے مرد باقاعدہ شرماتے لجاتے ...... اور سولہ سنگار کرتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں بددیانتی کا یہ عالم ہے کہ ہر کوئی ہر کسی کو دھوکا دیئے جاتا ہے۔ ہر مرد کے نزدیک اُس کی ماں، بیٹی، بہن اور بیوی...... پاک دامن ہیں۔ جب پارسائی کا یہ عالم ہے تو، پھر خراب جانے کون ہے؟

لوگ خوش فہمیوں کی دنیا بسائے بیٹھے ہیں۔ اندازہ کرو۔ تم مجھ سے چھپ چھپ کر ملتی ہو مگر وہ شخص تمھیں 'حور' سمجھتا ہے۔ تم اُسے 'فرشتہ' کہتی ہو حالانکہ وہ بھی 'حور' ہی کی مانند 'فرشتہ' ہوگا۔ میں حقیر سا انسان تم فرشتوں اور حوروں کے درمیان پس کر رہ گیا ہوں۔ تم میرے سامنے ایک اور مرد سے ملتی ہو۔ میں تمھیں پھر بھی 'دیوی' کہتا ہوں۔ وہ نہیں جانتا تم کسی اور سے ملتی ہو، اِس لیے تمھیں 'حور' جانتا ہے۔ تم سے کون زیادہ پیار کرتا ہے۔ تم ہی فیصلہ کرلو؟

تم نے جلد ہی یہاں سے چلے جانا ہے۔ امتحانوں کے بعد میں بھی یہاں نہ رہوں گا۔ مجھے پتہ نہیں، پھر دوبارہ زندگی کے کس موڑ پر جانے کیسی حالت میں ملتے ہیں؟ ہوسکتا ہے ایسا زمانہ آجائے کہ تم مجھ سے بات کرنا بھی مناسب نہ سمجھو۔ میں الفاظ کے وعدوں کو بے جان اور بے معنی سمجھتا ہوں، تاہم تم نے خود ہی کہا تھا کہ اگر تم میری نہ بن سکیں تو بھی ہر حال میں مجھے ملتی رہا کرو گی۔ میں الفاظ کی بجائے عمل کا عادی ہوں...... میں بھی تمھیں چاہتا ہوں......اور وہ شخص بھی خود کو تمھارا دیوانہ کہتا پھرتا ہے۔ اُس سے پوچھو کیا وہ شادی کے بعد تمھیں...... مجھ سے ملنے کی اجازت دے گا؟ اور وہ نہ کردے تو خدا کے لیے میرے پاس لوٹ آنا...... میں تم پر کبھی کوئی پابندی نہ لگاؤں گا۔ تم اگر چاہو تو اُس سے ملتی رہا کرنا...... میرے نزدیک چھپ کر ملنے اور اپنے آپ کو دھوکا دینے سے تو کہیں بہتر ہے کہ انسان، بغیر کسی خوف کے پورے اعتماد اور خلوص کے ساتھ جسے ملنا چاہے اُسے ملے۔

اگر کوئی یہ بات سن لے تو مجھے دیوانہ سمجھے...... سچ ہی تو ہے، جہاں لوگ عمر بھر چند بے معنی تصورات کے دائروں میں مقید رہتے ہیں، میں وہاں...... انسانی عظمتوں پر اعتماد کی بات کرتا ہوں۔

یاد ہے تمھیں ایک دن ہم شاہ جی کے ہاں گئے تھے۔ تم چارپائی پر بیٹھی تھی......اور میں لیٹا تھا۔ شادی کی بات ہو رہی تھی، میں نے تمھیں کہا تھا ''تم بڑے لوگ صدیوں سے ہم ناداروں کے

آقا رہے ہو۔ تم نے جب چاہا ہماری بہو بیٹیوں سے اپنے حرم سجائے۔ جب چاہا اُن کے ساتھ رنگ رلیاں منائیں...... ہمیں کھلونا بنایا اور جب چاہا توڑ دیا...... تم تو باشعور ہو، نئے دور کی پڑھی لکھی لڑکی ہو۔ اگر میرے ساتھ جھونپڑے تک آجاؤ...... تو کیا قیامت آجائے گی...... اگر تم کسی سپاہی کے بیٹے کے ساتھ غربت میں زندگی بسر کرلو، تو کیا زمین اپنی گردش چھوڑ دے گی؟ سورج اندھا ہو جائے گا؟ ستارے ٹوٹ جائیں گے؟ یا تاریخ انسانی کا دائمی دھارا بہنے سے انکار کردے گا؟ اور اگر کچھ بھی نہیں ہوگا تو...... تو خدا کے لیے مجھے چھوڑ کر نہ جانا''۔ اور تم رو کر مجھ سے لپٹ گئی تھیں۔ میری بنیان تمھارے آنسو کے سیلاب سے بھیگ نکلی تھی۔ جہاں تم نے منہ رکھا تھا۔ وہاں تمھاری لپ اسٹک، میری بنیان پر ایک خوبصورت بوسے کا نشان چھوڑ گئی...... اور مجھ چھوٹے آدمی نے وہ بنیان سنبھال کر رکھ لی۔ اُس دن تم مجھ غریب کے لیے روئی تھیں...... تمھارے آنسو، آبِ کوثر سے کم نہ تھے...... میری خواہش ہے کہ وہ بنیان میں قبر تک ساتھ لے جاؤں کہ میرے پاس اس زندگی کا...... کل اثاثہ یہی ہے۔

کل رات باہر رہنے کا تو کسی کو پتہ نہیں چلا؟ آج دن بھر تم نظر نہیں آئیں اس لیے مجھے پریشانی ہو رہی ہے۔ اب سوچ کر دل کو تسلی دے رہا ہوں کہ تم دن بھر سوتی رہی ہوگی۔

تمام رات اپنے بازو پر میرا سر رکھے، تم میرے بالوں میں اپنی مخروطی اُنگلیاں پھیرتی رہیں۔ رات کو جب بھی میری آنکھ کھلی، میں نے تمھیں اِسی حالت میں جاگتے پایا۔ میرا خیال ہے تم بالکل نہیں سو پائیں۔ بتاؤ نا ایسا کیوں ہے؟

ڈھیروں پیار

۱۲/مارچ ۱۹۷۳ء
لیاقت ہال

لڑکی

پھر تمھارے 'صاحب' سے ملاقات ہو ہی گئی۔ سچ پوچھو تو میں اس اچانک ملاقات کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ شاید خرم بھی میری ہی طرح ایسے کسی موقعے کے لیے آمادہ نہ ہوا ہوگا۔ لہٰذا بات رسمی ہیلو، ہیلو سے آگے نہ چل پائی۔ میں نے تمھاری جانب دیکھا، پل بھر کے لیے تمھارے ہونٹ پھیلے لیکن تمھارا چہرہ احساسِ نزع کے کرب میں ڈوبا نظر آیا۔

پیالی پر جھکتے ہوئے میں نے سوچا یہ شخص میری ضد ہے۔ اُس نے مجھے محرومیوں کے اَن گنت زخم دیئے ہیں۔ ایک اور قلابازی آئی۔ نہیں وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ تمھاری آغوش کی خوشبو سے آشنا ہے۔ میں اور وہ دو ایسے دریاؤں کی مانند ہیں جو مختلف سمتوں میں بہنے کے باوجود ایک ہی سمندر میں گرتے ہیں۔ اس لمحے وہ مجھے اچھا بھی لگا۔ پھر میری نظر اس کے ہونٹوں پر گئی۔ تمھارے ہونٹوں پر پیوست ہوتے ہوں گے اور میرا جیسے سارا خون پھٹ کر باہر آنے لگا۔ ایک اور موڑ آیا۔ یہ آدمی زیادہ سے زیادہ تمھارے ساتھ سو سکتا ہے۔ اپنے ایسے چار پانچ بچے پیدا کر سکتا ہے اور بس! یہ کام تو وہ کسی بھی عورت کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔ کیا ضرور کہ تم ہی ہو؟ اتنے میں صبیحہ نے جیسے پوری پانچ صدیوں کے سکوت پر ہتھوڑا برسایا۔ شکر جانو وہ کہیں سے نازل ہوگئی۔ ورنہ ہم تینوں جانے کب تک یوں ہی گُم صُم بیٹھے رہتے۔ خرم اُس کے ساتھ باتیں کرنے لگا اور میں نے جانا جیسے قبر سے باہر آگیا ہوں۔ جوں ہی صبیحہ واپس مڑی میں بھی اُٹھا۔ خرم کے چہرے پر طمانیت کی گہری لکیر اُبھری۔ تم بظاہر اپنے آپ پر قابو پا چکی تھیں۔ تاہم مجھے کسی دُور افتادہ سیارے کی طرح نظر آئیں جو اپنے مدار سے ہٹ کر خلاؤں میں کھو چلا ہو۔

میں اور صبیحہ ہاسٹل کی جانب چلے۔ راستے میں ناز گلاب کی کیاریوں پہ جھکی پھول توڑ رہی تھی۔

'شانتی' کی علامت کے طور پر میں نے اسے سفید گلاب کا پھول پیش کیا اور باقاعدہ کورنش بجا لایا۔ وہ شیطانی نظروں سے مسکرا دی پھر میں نے کانٹوں میں اُلجھا اس کا سفید دوپٹہ جھک کر چھڑایا۔ صبیحہ قریب کھڑی مسکراتی رہی۔ کہنے لگی "خدا خیر کرے آج ناز کی بڑی خدمت ہو رہی ہے۔" اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا ناز نے اُنگلی کے اشارے سے صبیحہ کو سمجھایا "دماغ چل گیا ہے۔" اور ہم تینوں ہنس دیئے۔

میں اُن دونوں کو پھولوں کے دامن میں چھوڑ کر سوچوں کے نوکیلے کانٹوں پر چلتا ہوا یونیورسٹی سے باہر کھلے کھیتوں کی جانب نکل گیا۔ زیرِ تعمیر مسجد سے ذرا پرے ایک منڈیر پر بیٹھ گیا۔ اُسی جگہ جہاں رؤف (عطی) نے پوائنٹ ۲۲ کی رائفل سے فاختہ کو نشانہ بنا کر تم سے فلم کی شرط جیتی تھی......اور پھر مجھے وہ منظر یاد کر کے ہنسی آ گئی۔ گُل نے رؤف (عطی) کو اپنی کندھوں پر اُٹھایا ہوا تھا اور ہم سب اس کے اردگرد 'شیر کیمپس' زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ شاہدہ نے گل کو، ذرا سا دھکا لگا دیا اور بے چارہ 'شیر کیمپس' لڑھکتا ہوا کھیت میں جا گرا تھا۔ عین اس جگہ بیٹھے بیٹھے مجھے احساس ہوا جیسے میں زخمی فاختہ ہوں اور کھیت میرے رستے خون سے بھر گئے ہیں۔ کیا لوگوں کی آنکھیں یہ سب کچھ دیکھنے سے معذور ہیں؟

ذہن نے ایک اور انگڑائی لی۔ دو متضاد انسانوں سے بیک وقت پیار کرنا ممکن ہے؟ یاد ہے نا، جب پہلے دن ملے تھے۔ شدید قربت کے اُن لمحات میں میرے منہ سے بے اختیار اس گاؤں والی لڑکی کا نام نکل گیا تو......تم ناراض ہو کر اُٹھ بیٹھی تھیں۔ پھر میں نے ایک طویل خط میں، تفصیل سے اپنا ماضی لکھا تھا۔ اور اب یہ عالم ہے کہ کسی کو بلاؤں تو زبان سے تمھارا نام بہہ نکلے گا۔ جانے تم دو آدمیوں سے بیک وقت پیار کے گرم اُبلتے جذبات کے ساتھ کس طرح ملتی ہو۔ کوئی ہم سا ہو تو ایک شغل برپا کرے۔ ایک سے دوسرے کا ذکر چلے اور دوسرے کے ساتھ پہلے کی باتیں ہوں اور دونوں ہی اپنے اپنے کیے اور نہ کیے پر شرمندہ ہوتے رہا کریں۔

پھر مجھے تمھاری وہ بات یاد آئی "میں کوئی مشین تو نہیں انسان ہو۔ دو آدمیوں سے بیک وقت ایک سا پیار کیسے کر سکتی ہوں۔ ماں بھی اپنے بچوں سے یکساں پیار نہیں کر سکتی۔ خرم کے بیٹھے بیٹھے اچانک خیالوں میں کھو جاتی ہوں۔ جانتے ہیں، اُس وقت میں آپ کے متعلق سوچ رہی ہوتی

ہوں۔ آپ دونوں کی عادتیں ایک دوسرے سے کتنی مختلف ہیں۔ ہر بات پر مجھے دوسرا یاد آجاتا ہے۔ شام کے وقت میں خرم کے ساتھ کار میں بیٹھے آپ کو کیفے کے آس پاس ٹہلتے دیکھا کرتی ہوں۔ پچھلے دنوں آپ نہیں تھے۔ آپ کی قسم مجھے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی تھی۔ اب تو خرم بھی مجھے کئی دفعہ کہہ چکا ہے کہ تم بدلتی جارہی ہو۔ ایک دن میں آپ کے متعلق بات کررہی تھی تو اُس نے کہا 'یوں لگتا ہے کہ شادی کے بعد مجھے اپنے گھر میں ایک کمرہ تمھارے روحانی پیغمبر کے لیے مخصوص کرنا پڑے گا اور اس کمرے میں مجھے داخل ہونے کی اجازت نہ ہوگی' لیکن آپ بھی مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ میں کہاں جاؤں؟''

اور میں نے تمھیں شاہدہ کے سامنے ہی سینے سے لگا لیا تھا۔ صبیحہ اور شہلا، عثمان سے سکوٹر چلانا سیکھ رہی تھیں اور ہم اندھیرے میں ڈوبے، کیفے ٹیریا کے ایک کونے میں بیٹھے بظاہر اُن کا انتظار کررہے تھے۔ صبیحہ ہم تینوں پر معنی خیز آوازیں بھی لگا رہی تھی۔ تم نے اتنی کھل کر بات کی تھی اور شاید میں کبھی بھی یہ بات بھلا نہ سکوں۔ مجھے یقین ہے کہ تم انسانی زندگی گزارنے پر آمادہ ہوجاؤ گے۔ تمھیں یہ کرنا ہی ہوگا۔ ورنہ ہم دونوں اُکھڑے ہوئے درخت کی طرح زمین پر آرہیں گے۔ میں یہی کچھ سوچتا ہوا وہاں سے واپس پلٹا۔

رؤف (عطی) کے ساتھ 'ایک شام' منائی جائے۔ مجھے آج پتہ چلا ہے کہ جب وہ پیدا ہوئے تو...... اُن کی ماں نے لاڈ سے کہا تھا ''میرا بیٹا مجسٹریٹ بنے گا۔'' چنانچہ جناب نے خاموشی سے مجسٹریٹی کا امتحان دے مارا ہے۔ بڑی مشکل سے یہ خبر کھینچی ہے۔ پروگرام بنا ہے کہ جب وہ ہم میں سے کسی کو نظر آئیں۔ فوراً کہا جائے ''ماں کا کیا ہوتا ہے۔ وہ بے چاری تو پیار کے مارے کہہ دیتی ہے۔ میرا بیٹا کرنل، جرنل، بنے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بیٹا بھی اِس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے۔ چلو اگر ماں نے غلطی سے کہہ ہی دیا تھا کہ میرا بیٹا جج بنے گا۔ تمھیں تو کچھ احساس ہونا چاہیے تھا۔'' بھائی صاحب کو دیکھو کیا خواب دیکھ رہے ہیں؟

عوامی میلے پر ضرور چلیں گے۔ کارڈز کا کوئی بندوبست کرالیں گے۔ جس دن بھٹو صاحب آئیں اُس دن چلنا چاہیے اُن کی تقریر سن لیں گے۔ ویسے اُس دن رش بہت ہوگا۔

میرا خیال ہے صبیحہ کو شک ہوگیا ہے۔ وہ بڑی معنی خیز باتیں کررہی ہے۔ بچی تو نہیں، ہر

وقت ساتھ رہتی ہے۔ مانا کہ ہم کسی کے سامنے کوئی بات نہیں کرتے۔ پھر بھی لوگ ہماری آنکھوں سے پیار کا اُمڈتا طوفان تو دیکھ ہی سکتے ہیں نا۔ صبیحہ کم از کم اتنا ضرور جانتی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے اُسے اعتماد میں لے ہی لو۔

سائیکالوجی پر تمھیں دو کتابیں بھجوا رہا ہوں۔ دونوں فرائڈ پر کمنٹری ہیں۔ تم نے فرائڈ پر جو کتاب مانگی تھی، وہ ہماری لائبریری میں موجود نہیں۔ شعبۂ نفسیات میں ہو تو، مہ جبیں وغیرہ سے کہہ دینا وہ تمھیں لا دیں گی۔ توبہ توبہ، تمھارے اُستاد بھی کتنے بے سُرے ہیں کہ فرائڈ کو صرف اور صرف جنس کا بادشاہ سمجھتے ہیں۔ فرائڈ سیکس یعنی جنس کے عام تصور کی بات نہیں کرتا۔ وہ ایک نئی اور جامع اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ فرائڈ Libido کو زندگی کی قوتِ محرکہ گردانتا ہے۔ وہ اُس کو محض جنس قرار نہیں دیتا۔ اگر تمھارا کوئی اُستاد Libido کا ترجمہ سیکس کرتا ہے تو وہ فرائڈ پر بھی ظلم کر رہا ہے اور علم پر بھی۔

فرائڈ کی یہ غلطی نہیں کہ اُس نے جنس کی اہمیت کو بنیاد بنایا۔ اُس کی بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ انسان کے افعال کو لاشعور کے اندھے دیوتا کی بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔ وہ حال کو ماضی کا تابع بنا دیتا ہے۔ وہ معاشرے کی ٹھوس مادی صورت کو جھٹلا کر ماورائیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ شعور یا تحت الشعور فرد اور معاشرتی صورتِ حال کے اتصال سے جنم لیتا ہے۔ معاشرہ اور اُس کی مادی صورتیں فرد کی نفسیات کو مرتب کرتی ہیں اور پھر فرد اپنے افعال سے گردوپیش کو بدلتا ہے۔ اپنے آپ کو بدلتا ہے۔ عمر بھر اپنے خیالات اور عادات میں قطع و برید کرتا رہتا ہے۔ جب کہ فرائڈ کا انسان ایک مفعول، مجبورِ محض اور اپنے لاشعور کا ابدی غلام ہے۔ تاہم، یہ دونوں کتابیں پڑھ لو۔ کسی دن بحث کر لیں گے۔

بہت سا پیار

تمھارا ہمیشہ

۱۹/ مارچ ۱۹۷۳ء

لیاقت ہال

میری زندگی

آج شام واپسی کے وقت تمھیں جانے کیا ہو گیا تھا۔ ایک قدم اکیلے چلنے کو تیار نہ تھیں۔ ایک ہی ضد تھی ''ہاسٹل تک آپ ساتھ چلیں''۔ پتہ ہے راستے میں کتنے لوگوں نے ہمیں دیکھا؟ اور جو کوئی بات بنائے گا پھر مجھے کوستی پھرو گی۔ مہ جبیں اور طلعت وغیرہ نہر کی اُس جانب سے معنی خیز مسکراہٹوں کے تیر پھینک رہی تھیں۔ یاد ہے نا وہ پہلے بھی اشارۃً کہہ چکی ہے ''خرم بہت اچھا آدمی ہے۔'' امتیاز بانو بھی کھلکھلا دی۔ چلو خیر، خدا اُسے خوش رکھے، وہ افواہ ساز لڑکی نہیں۔ نہر کی پلی پر نسیم اور بلو وغیرہ کھڑے تھے اور یہ سارے لوگ ہمیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے اور تم اتنی اپ سیٹ تھیں کہ چلتے ہوئے مجھ سے بار بار ٹکرا رہی تھی۔ بدلی بدلی سے، خوف زدہ سی، پیاری پیاری سی۔

جانتی ہو اس وقت مجھے کیا یاد آ رہا ہے؟ وہ انمول لمحات جب ہم شاہ جی کی کار سے اُترے تھے کیمپس کے اس خاموش گوشے میں تم کھڑی ہو گئیں اور کہا۔ ''چند منٹ اس سڑک پر ٹہل لیں۔'' پھر تم نے دوربین سنبھالی اور مسجد سے ذرا پرے کھیتوں کی جانب کشا کشاں، بڑھتے جوڑوں کو دیکھنے میں محو ہو گئیں۔ میں سگریٹ سلگا کر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ تم ہر جوڑے کو پہچان کر کمنٹری کر رہی تھیں اور میں تمھیں دیکھنے میں مصروف تھا تم کہہ رہی تھیں۔ ''وہ دیکھو شاعرہ نے اپنی طویل نظم ایسی زلفیں اپنے دوست کے شانوں پر بکھیر دی ہیں۔'' پھر اچانک تم نے دوربین پرے پھینکی اور مجھ سے لپٹ گئیں۔ وہ چند لمحے جیسے پوری کائنات سمٹ کر میری آغوش میں بند رہی۔ تم نے ذرا سا سر اُٹھایا اور کہا ''کاش ہم پہلے ملے ہوتے۔ میں دنیا کو بتا دیتی کہ پیار کیا ہوتا ہے۔ میں بانہوں میں بانہیں ڈال کر آپ کے ساتھ پھرا کرتی۔ اس طرح چھپ چھپ کر کبھی نہ ملتی۔'' اور تمھاری آنکھوں سے

آنسو ڈھلک آئے۔

یہ لمحہ کتنا قیمتی تھا!!!

پھر تم نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھاما اور بغیر کچھ کہے اُٹھ کھڑی ہوئیں، عین اُس لمحے سورج نے آخری ہچکی لی۔ ڈوبتے سورج کے پس منظر میں تمھارے اُبھرنے کا منظر بہت حسین تھا۔ ہم تم کیمپس کی اس ویران سڑک پر اکٹھے ٹہلتے رہے۔ ہاتھوں میں ہاتھ لیے اور قدم سے قدم ملائے۔ اِس وقت خبر ہے مجھے کیا محسوس ہو رہا تھا...... جیسے ہم صدیوں سے یوں ہی ٹہل رہے ہیں۔ جیسے ہم امر ہیں۔ ہر روپ میں اَن مٹ...... ہم ہی کائنات۔ ہم ہی اس کے سینے میں چھپا راز اور ہم اس کے متلاشی بھی۔

چلو تمھیں یہ احساس تو ہوا کہ ہماری طرح چھپ کر ملنا، اپنائیت کی توہین ہے۔ اپنائیت دوسروں کے سامنے اپنانے کا نام ہے۔ دنیا کے سامنے لاتعلق بن جانا ادھورا پیار ہے۔ آج جو باتیں تم نے بتائی تھیں ان پر کسی وقت تفصیل سے بحث ہونی چاہیے اور آخری فیصلہ تمھیں خود کرنا چاہیے۔ میں تو بہت پہلے تمھیں اپنی خواہش سے آگاہ کر چکا ہوں۔ تم غلط سمجھتی ہو کہ خرم خودکشی کر بیٹھے گا۔ بڑے لوگ اپنی موت مرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ دوسروں کے لیے کون مرتا ہے؟ ان کا بس چلے تو وہ آبِ حیات کا گھونٹ لے کر سدا جینے کی آرزو پوری کریں۔ مرنے کے لیے بہت حوصلہ چاہیے اور اتنا ڈھیر سارا حوصلہ کسی کو مل جائے تو پھر اسے اپنی زندگی کا چراغ گُل کرنے کی بھلا کیا ضرورت؟

میں اِس بات سے بھی متفق نہیں کہ تم ایک سے بھاگ کر دوسرے کے پاس گئی تھیں۔ اب اُسے چھوڑ کر تیسرے کے ساتھ جاؤ تو لوگ تمھیں زاہدہ کی طرح بے وفا کہیں گے۔ بھائی یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ انسان کسی کو چھوڑ کر کسی کے پاس نہیں جاتا بلکہ وہ ایک صورت حال سے دوسری میں چلا جاتا ہے۔ مگر ساتھ وہ ہمیشہ اپنے ہی رہتا ہے۔ تم خرم سے وفا کرو گی تو مجھ سے بے وفائی ہو گی اور جانتی ہو، بے وفا کون ہوتے ہیں؟ جو دولت کے لیے انسان کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ زاہدہ ہمیشہ سے اچھی لڑکی تھی۔ اُس نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ لوگوں نے لفظِ وفا سے غلط معانی وابستہ کر رکھے ہیں۔ تم حقیقتوں کو جانو۔ لفظوں سے خوف زدہ کیوں ہوتی پھرتی ہو۔ وفا صرف خرم کے ساتھ رہنے کا نام

نہیں؟ ہاں یہ بات البتہ قابلِ ذکر ہے کہ خرم سے کیسے بات کی جائے۔تمھارے گھر والوں سے بات دوسرا مرحلہ ہے۔تم کہتی ہو کوئی ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ خرم تمھیں کوئی الزام دیے بغیر، یا یہ جانے بغیر کہ تم اُس کی بجائے میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو، خاموشی سے تمھیں چھوڑ جائے۔ میں نے تمھیں آج بھی بتایا تھا، اب پھر کہتا ہوں کہ میں محبت سے لے کر نفرت تک کسی مقام پر بھی کسی کو دھوکا دینا جائز نہیں سمجھتا۔خرم تمھیں پیار کرتا ہے نا؟ اُسے کہو کہ شادی کے بعد بھی تم اسے ملتی رہا کروگی۔ جیسا کہ میں نے تمھیں پہلے بھی بتایا تھا میرے لیے اِس اذیت ناک صورت کا سامنا کرنا دھوکا دینے کی نسبت آسان ہے۔ میری جان خرم کو طریقے سے بتانا ہی ہوگا۔ میں جانتا ہوں یہ کتنا تلخ کام ہے۔ پر زندگی کی خوشیاں انھیں تلخیوں کے اندر چھپی ہوتی ہیں۔ میں محسوس کر رہا ہوں، تم کتنی شدید کشمکش کا شکار ہو۔تمھاری آنکھوں کے اردگرد سیاہ حلقے اس ذہنی اذیت کا نشان ہیں۔تم سوچتی ہو، محبت کے بغیر زندگی کا طویل سفر طے نہیں کر سکوگی۔ جب تم دیوی بن کر محبت کی مہکتی فضاؤں میں پہنچتی ہو، اُس لمحے تم سینے پر ہاتھ مار کر مجھے اپنانے کا اعلان کر دیتی ہو۔(جیسے کل تم مجھ سے لپٹ کر روتے ہوئے مجھے کبھی نہ چھوڑنے کی قسم کھا رہی تھیں) لیکن جوں ہی تمھارے قدم زمین کو چھوتے ہیں، خرم اپنی دولت، بنگلے اور اعلیٰ سماجی رُتبے کے رَتھ پر سوار ہو کر، دوبارہ تمھارے ذہن کے دریچوں پر آن دستک دیتا ہے اور تم پھر سر پکڑ کر بیٹھ جاتی ہو۔تم محبت کی متلاشی بھی ہو اور شاندار زندگی کے خوابوں سے بیدار بھی نہیں ہونا چاہتی۔(شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، اکثر شُرفأ کا یہی شیوہ ہے) تم فیصلہ نہیں کر پاتیں کہ کسے چھوڑو اور کسے رکھو۔ یہی وجہ ہے کہ تم دو انتہاؤں کے درمیان غوطے کھا رہی ہو لیکن میں اور خرم دو متضاد راستے ہیں۔تم بیک وقت اِن دونوں راستوں پر کب تک چل سکوگی؟ کبھی نہ کبھی ایک کو اپنانا اور دوسرے کو چھوڑنا ہوگا۔

تم بار بار کہتی ہو ''آپ کوئی حل سوچیں۔آپ مجھے بتائیں میں کیا کروں۔'' میری جان، تم خرم کو چھوڑنا تو چاہتی ہو لیکن اِس ذمہ داری سے بچنا بھی چاہتی ہو۔تم اپنی ذات کی آزادی سے خوف زدہ ہو۔تم اپنے آپ سے خوف زدہ ہو۔ اِس سارے مسئلے کا حل تمھارے سامنے موجود ہے۔تم جانتی ہو تمھیں کیا کرنا چاہیے۔لیکن تم مکمل فیصلہ کرنے سے قاصر ہو۔ جب تم یہ کہتی ہو ''آپ ہی کا فیصلہ مجھے قبول ہے'' تو مجھے خوشی ہوتی ہے کہ تم مجھ پر کتنا اعتماد کرتی ہو۔لیکن میں

صرف اپنے متعلق فیصلہ کر سکتا ہوں۔ میرا فیصلہ تمھارے سامنے ہے۔ لیکن تمھاری جانب سے میں کوئی فیصلہ کیسے کر سکتا ہوں؟ میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ تم بھی میرے ساتھ رہنا چاہتی ہو۔ یہ فیصلہ تمھیں کرنا چاہیے۔ یہ تمھارا حق ہے۔ میں محبت کے نام پر تمھارا حق اور تمھاری آزادی نہیں چھین سکتا۔ میں محبت کے نام پر، تمھیں فریب سے حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ میں تمھارے اعتماد کو اپنی خواہش کے تابع نہیں بنانا چاہتا۔ میں تمھیں فتح نہیں کرنا چاہتا۔ ہوسکتا ہے، میری بات تمھاری سمجھ میں نہ آسکے۔ جس جہاں میں عورت کو کھیتی سمجھ کر سینچا جاتا ہو، وہاں میں اسے انسان بنانا چاہتا ہوں۔

ہوسکتا ہے مجھے اس جرم کی سزا ملے اور تمھارے ہی ہاتھوں ملے۔ ہوسکتا ہے کل تم میری محبت کی بجائے خرم کی دولت کو اپنا لو (بُرا نہ منانا، میں محض امکان کی بات کر رہا ہوں)......لیکن جو بھی ہو، ہوتا رہے۔ میں تمھارے اعتماد کو بہانہ بنا کر، تمھیں فریب نہ دے سکوں گا۔ یہ میری مجبوری ہے۔ ہاں مجھے تمھارے وعدے پر یقین ہے۔ مجھے یقین ہے تم اپنی بات پر قائم رہو گی اور خود کو کبھی فروخت نہ کرو گی۔ تاہم تم خود ان باتوں پر غور کرو، میں بھی سوچتا ہوں، ممکن ہو تو شاہدہ کو بھی خط لکھ دو، کوئی حل نکل ہی آئے گا۔

ہاں بھئی امتحان دس اپریل سے شروع ہو رہے ہیں۔ میرا پہلا پیپر سائیکالوجی کا ہے۔ تم کوشش کرونا میرے امتحانوں تک تو یہیں رہ لو۔ گھر والوں سے کوئی بہانہ لگا لو۔ انہیں لکھ سکتی ہو کہ تمھارا کوئی سمیسٹر باقی ہے۔ یہ بات کیسے ممکن ہو گی تم سات اپریل کو یہاں سے فارغ ہو کر چلی جاؤ اور پھر ۲۹ اپریل تک اپنی چھوٹی بہن کو لینے آسکو۔ ہوسکتا ہے گھر والے تمھیں واپس نہ بھیجیں۔ مجھے پتہ ہے تمھارے گھر والے اب بہت تنگ ہیں۔ تمھیں فوراً واپس بلانا چاہتے ہیں۔ مگر انھیں معلوم نہیں کہ اُن کی صاحبزادی کا واسطہ کن لوگوں سے پڑ گیا ہے؟ تمھارے ڈیڈی پرانے زمانے کی طرح فوج اکٹھی کریں اور پھر کیمپس پر حملہ آور ہوں تب ہی تمھیں یہاں سے چھڑا کر لے جاسکتے ہیں۔ ورنہ سیدھے ہاتھوں تو ہم بھی نہیں جانے دیں گے۔ اب تو خرم صاحب بھی تمھیں یہاں سے فوراً چلے جانے کی تجویز دے رہے ہیں؟ میرا خیال ہے وہ بہت کچھ سمجھ چکا ہے۔ ورنہ وہ کب چاہتا کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ میں نے اپنا کمرہ چھوڑ دیا ہے۔ ضیاء اقبال کے پاس آگیا

ہوں۔ وہ کل واپس جا رہا ہے۔ عطی اور میں یہیں رہ کر امتحان کی تیاری کریں گے۔ میرے کمرے میں تو ہر وقت سیاست کا میدان جما رہتا تھا۔ اِدھر کوئی کتاب کھولی اُدھر کوئی آن دھمکا اور جب تنہائی میسر آتی تو تم میرے پہلو میں آن بیٹھتیں۔ عطی ساتھ ہوگا تو شاید کچھ پڑھ سکوں۔ ویسے اللہ ہی حافظ ہے۔ ایمان سے تمھارا سمسٹر سسٹم اِس سے کہیں اچھا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ جان چھوٹتی رہتی ہے۔ ایک ہم ہیں کہ پورے دو سال بعد میدانِ جنگ میں اُترنا پڑتا ہے۔

ہاں یاد آیا، میں کافی دنوں سے سوچ رہا تھا کہ میں نے جتنے خطوط تمھیں لکھے ہیں انھیں کتاب کی صورت میں شائع کرا دیا جائے۔ تمھارا کیا خیال ہے؟ دیکھو نا مستقبل کا کیا پتہ، جانے کیا ہو، میں نادم ہوں۔ تمھیں الفاظ کے بغیر کچھ نہ دے سکا۔ میرے ساتھ رہو گی تو بھی تمھیں کیا دے پاؤں گا؟ اور پھر انھیں شائع کرانے میں ہمارا نقصان بھی کیا ہے؟

رات ڈوبی جا رہی ہے...... ذرا منہ قریب لاؤ...... بس

پیار

۲/اپریل ۱۹۷۳ء
لیاقت ہال

لڑکی

میں نے واپسی پر خطوط کا پیکٹ کھولا۔ مجھے تو ایک دو خط کم لگتے ہیں۔ تم اپنا باکس پھر سے دیکھ لینا۔ شاید وہیں اِدھر اُدھر پڑے ہوں۔ مل جائیں تو چھ اپریل کی رات کو ساتھ لیتی آنا۔ رات کے وقت ان سب کو دوبارہ دیکھ لیں گے۔ ویسے تمھاری بات صحیح ہے کہ اگر انھیں شائع کرانا ہے تو پھر اصلی ناموں کے ساتھ ہی ہونے چاہئیں اور ان میں کوئی کانٹ چھانٹ نہیں ہونی چاہیے۔ میں نے یوں پوچھا تھا کہیں تمھیں اصلی ناموں پر اعتراض نہ ہو ورنہ میں تو سرے سے جعلی قصے لکھنے کا قائل ہی نہیں۔

7 اپریل کو تم نے یہاں سے چلے جانا ہے۔ صرف چار دن باقی ہیں۔ وقت سمٹ رہا ہے۔ تمھارے بعد کس قدر تکلیف اور کتنی پریشانیاں ہوں گی! کیا خبر مستقبل کے دامن میں کیا چھپا ہے؟ میرے پاس صرف اندازے ہیں۔ اچھے یا بُرے اندازے۔ میں جو زندگی کو ہمیشہ دلیل کی کسوٹی پر ماپنے کا عادی تھا، آج حیرت زدہ بیٹھا ہوں۔ آج مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے زندگی بھی ایک اندازہ ہے۔ تم یہاں سے جانے کے بعد کبھی مل پاؤ گی؟ صرف اندازہ۔

...... چھ کی رات کا پروگرام تو پہلے ہی بن چکا ہے۔ سات کی صبح سویرے سویرے تم واپس آ کر اپنا سامان وغیرہ تیار کر لینا۔ اگر تم ۱۲ بجے تک سب لوگوں سے مل کر فارغ ہو سکو تو ۱۲ بجے سے لے کر ۴ بجے تک آخری چار گھنٹے ہم پھر مل لیں گے۔ تمھاری گاڑی تو سات کی شام کو جائے گی نا......

خرم چار تاریخ تک آ جائے گا۔ اس کے ساتھ کسی وقت باہر چلی جانا اور سکون سے اُسے آنے والے وقت کے متعلق بتانا۔ ٹھیک ہے ابھی اُسے میرے متعلق نہ بتاؤ۔ تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ تم اپنے

کزن کے ساتھ زندگی کاٹنے پر مجبور ہو جاؤ...... جانے حالات کون سا رُخ اختیار کرتے ہیں؟ مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے پچھلی دفعہ وہ خاصا مایوس ہو کر گیا تھا۔ لڑکی! میں نے بہت دُکھ سہے ہیں، جبھی میں خرم جیسے شخص کو بھی دُکھ دینے کے لیے تیار نہیں۔ اُسے کہتی جانا کہ وہ بھی کبھی انسان بن کر سوچ لیا کرے، تمھیں اُس نے ہمیشہ مقبوضہ کشمیر سمجھا ہے اور جوں ہی تم نے سوچنا چاہا اُس کی طبیعت خراب ہو جاتی رہی۔

اور میں کتنا دیوانہ ہوں، میں اس کی تکلیف بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے پاس مفلسی ضرور ہے، لیکن میرا حوصلہ اُس سے زیادہ ہے۔ دیکھونا، یہ سارا وقت اُس نے تمھارے زانوؤں پر سر رکھ کر گزارا اور میں نے تمھارے آغوش کو ترستے ترستے...... مگر آج تم جانے والی ہو۔ وقت بیت چکا۔ اُس کی خوشیاں دائمی تھیں نہ میرا غم۔ آج ہم دونوں اک نئے موڑ پر ہیں۔ نئی خوشیوں اور نئے غموں کے دوراہے پر اور میری جان! یہ بھی بیت جائے گا۔ اِسی طرح ہم ایک اور نئے موڑ پر پہنچ جائیں گے۔ کسی انجانی ابتدا پر، سکوت، خاموشی اور عدم کے موڑ پر...... جہاں پہنچ کر ہمیں یہ خوشیاں اور غم دونوں ہی بے معانی نظر آئیں گے...... اور جب انتہا صرف یہی ہے تو پھر لوگ دوسروں کو دُکھ دے کر جانے کیوں خوش ہوتے ہیں؟ خرم تم پر قبضہ جمانا چاہتا ہے۔ تمھارا کزن تم پر فتح کا جھنڈا لہرانا چاہتا ہے۔ ٹوتھ برش سے لے کر انسان تک، لوگ ہر شے کو خریدنے پر بضد ہیں۔ اپنی خوشیوں کے لیے دوسروں کے گلے پر چھری چلانے سے دریغ نہیں کرتے...... اندھی سوچوں کے سراب میں بھٹکتے ہوئے یہ لوگ اپنی جھوٹی خوشیوں کے لیے انسان کا خون جانے کب سے بہا رہے ہیں۔ بتاؤنا، سارے لوگ یہ باتیں کیوں نہیں سوچتے؟

میجر صاحب کا چھوٹا بھائی تو خاصا سمارٹ ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا، جیسے اُس کا موڈ خاصا آف تھا۔ تم بھی کچھ اچھے موڈ میں نہ تھیں۔ کیا اُس سے پھر جھگڑا ہو گیا؟ میرا خیال ہے، خرم اور تمھارے متعلق باتیں اُن لوگوں تک پہنچ چکی ہیں۔

چار کی شام عطی تمھارے جانے کے غم میں سب کو چائے پلا رہا ہے۔ پانچ کی شام میرا پروگرام ہے۔ اگر چاہو تو خرم سے بھی کہہ دینا۔ صبیحہ اور عطی تو ہمیں جہیز میں ملے ہیں۔ وہ ہم سے پہلے حاضر ہوں گے۔ سبھی لوگ، کسی اچھے ہوٹل میں چلیں گے۔ آخری موقع ہے، گپ شپ بھی لگ

جائے گی۔ عطی سے پوچھا تھا۔ وہ تو کہتا ہے صبیحہ میں اُسے کوئی خاص دلچسپی نہیں۔ یوں بھی سات بیٹیوں جیسا ایک بیٹا ہے۔ یہ بھاگ دوڑ اُس کے بس کا روگ نہیں۔ عورتوں کو خاوند چاہئیں......مگر وہ بیٹا ہے۔

ابھی تک ذہن اِس بات کو قبول نہیں کر پایا کہ تم واقعی یہاں سے جا رہی ہو۔ تم نہ ہو گی تو کیا میں اِن راستوں پر اکیلے بھی چل پاؤں گا؟ تمھارے بغیر جانے کیسے زندہ رہوں گا؟ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ جانتی ہو میں کتنا حساس ہوں۔ اِس دُکھ نے مجھے لے ڈوبنا ہے۔ پھر اُوپر سے امتحان آ گئے ہیں۔ تم کہتی ہو، فرسٹ ڈویژن لوں اور ساتھ ہی مجھے تنہا چھوڑے جا رہی ہو۔ سنو، اگر تاریخ انسانی میں کبھی معجزے ہوئے ہیں تو کیا اب ایک اور نہیں ہو سکتا۔ صرف ایک ایسا کہ تم رُک جاؤ اور بس......تمھارا 'گفٹ' پسند آیا۔

بہت سا پیار

۱۱/اپریل ۱۹۷۳ء
مزنگ لاہور

کنول

اس وقت دن کے کوئی بارہ بجے ہوں گے۔ کمرۂ امتحان سے سیدھا یہیں پہنچا اور اسی سنسناتے مکان میں تنہا بیٹھا تمھیں خط لکھ رہا ہوں۔ بشارت وغیرہ ابھی تک واپس نہیں لوٹے اور تمھیں یہاں سے گئے آج چوتھا دن ہے۔ یہ میرے سامنے وہی بستر ہے، جس پر ہم آخری بار لیٹے تھے۔ اُسی طرح شکن آلود، تکیہ چارپائی کے درمیان پڑا ہے اور چادر ایک جانب ڈھلکی ہوئی۔ سگرٹوں کے ٹکڑے اُسی بے ترتیبی سے فرش پر بکھرے پڑے ہیں۔ چارپائی کے نیچے پانی کا آدھا گلاس رکھا ہے۔ اس پہ تمھارے لبوں کی سرخی پیوست ہے۔ میں نے یہاں داخل ہوتے ہی گلاس کو ہونٹوں سے لگایا اور پھر بغیر پیئے اسے وہیں رکھ دیا۔ سب کچھ اِسی طرح پڑا ہے، جیسے تم یہاں سے ابھی ابھی اُٹھ کر باہر نکلی ہو۔ زیادہ سے زیادہ نیچے سیڑھیوں تک پہنچی ہوگی۔ آواز دوں تو فوراً پلٹ آؤ گی۔

اِس مختصر سے کمرے میں، میری زندگی کی بہت سی خوشگوار یادیں بند ہیں۔ پہلے دن تم اسی اکلوتی کرسی پر بیٹھی تھیں اور میں تمھارے سامنے بستر پر۔ کتنی دیر تک ہم دونوں خاموش بیٹھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ تم جانے کیا سوچ رہی تھیں۔ میں تو اُس لمحے اپنے آپ کو یقین دلا رہا تھا کہ واقعی تم ہو اور مجھ سے ملنے آئی ہو اور پھر میں اس حسین حقیقت کے قدموں پر جھک گیا۔ تم پریشان سی ہو کر اُٹھ بیٹھیں۔ تم نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ مجھ سا آدمی کبھی کسی کے پاؤں چوم سکتا ہے۔ یقین جانو، میرا بھی اپنے متعلق یہی خیال تھا۔ مگر انسان کو گرتے کیا دیر لگتی ہے۔

اِسی کمرے میں ہم ایک بار لڑے بھی تھے۔ تم تکیے کے نیچے منہ چھپائے روتی رہی تھیں۔ یاد ہے نا، وہ چرس والا قصہ؟ یہیں کئی بار رات کے وقت ہم دونوں نے فرش پر بستر لگایا۔ جانے تمھاری

یہ خواہش کیوں رہتی تھی کہ زمین پر سویا جائے۔ وہ کارنس آج خالی پڑی ہے، جہاں تم آتے ہی اپنا دوپٹہ اور دھوپ کی عینک اُتار کر رکھا کرتی تھیں۔ تمھاری عادت تھی، جوتے اُتارتے ہی شلوار کے کھلے پائینچوں میں اپنے پاؤں چھپا لیتیں، پھر میرے قریب آنے سے قبل ہی تمھاری آنکھیں بند ہو جایا کرتی تھیں۔ جانتی ہو، اس وقت مجھے کیا یاد آ رہا ہے، تمھاری ٹھوڑی کا وہ تل، جسے میں بہت چوما کرتا تھا۔

آج سے صرف چار دن پہلے عین اِسی بستر پر تم مجھ سے لپٹی، چیخیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ مجھے اب بھی اس کمرے کے ہر کونے سے سسکیوں کی سرگوشیاں سنائی دے رہی ہیں...... میں اِس دن زندگی میں پہلی بار رویا تھا، مجھے چپ کراتے کرتے تمھاری سسکیاں اور بلند ہو جاتیں ''اب بس کریں نا! اب بس!'' آنسوؤں کے بہتے سیلاب میں تم نے یہ بات جانے کتنی بار کہی تھی۔ لیکن شاید میری طرح زندگی میں ایک آدھ بار رونے والے لوگ اپنے جنم کے سارے دُکھوں پہ رویا کرتے ہیں۔ میرے آنسو تمھارے چہرے پر گر رہے تھے۔ تم نے مجھے زور زور سے ہلا کر کہا ''خدا کے لیے اب بس کیجیے میں مر جاؤں گی۔ میں آپ کے پاس بہت جلد واپس آ رہی ہوں۔ راجہ صاحب پلیز۔'' یہ کہہ کر تم خود بھی رونا شروع کر دیتیں......

اوہ خدایا!...... یہ یادیں! مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا دیوی، میری آنکھوں میں پھر سیلاب اُمڈ آیا ہے، لیکن میرے قریب کوئی نہیں جو مجھے کہے ''اب بس کیجیے۔'' کوئی نہیں کوئی نہیں......

اُس آخری دن تمھارے یہاں سے جانے کے بیس منٹ بعد میں نے رکشہ پکڑا اور کیفے کے قریب جا اُترا۔ خرم اپنی کار میں تمھارے ہاسٹل کی جانب نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ میرا خیال ہے تمھاری امی کی وجہ سے غریب اتنی دُور کھڑا تھا۔ تم ہاسٹل کے گیٹ پر اپنی سہیلیوں سے آخری بار گلے مل رہی تھیں۔ میں اپنے کمرے کی جانب بھاگا کہ تمھیں یہاں سے جاتے ہوئے نہ دیکھ سکوں۔ چارپائی پر گرا اور پھر مجھے کچھ یاد نہ رہا۔

کوئی نو بجے عطی نے آ کر اُٹھایا۔ میں انتہائی تیز بخار میں جل رہا تھا۔ وہ مجھے ڈسپنسری لے گیا۔ پوری کوشش کے باوجود میری نظر تمھارے کمرے کی جانب اُٹھ گئی، جو میری طرح اداس، تاریک اور تنہا تھا۔ عطی سے آنکھ بچا کر میں نے آنسو پونچھے۔ اُسے بھی تمھارے جانے کا بہت دُکھ

ہے۔ لیکن اُسے میرے اور تمھارے تعلق کا علم نہیں۔ اُس کا خیال ہے ہم سبھی لوگ آپس میں دوست تھے اور بس۔ اب اُسے بتانا اچھا نہیں لگتا۔ تم واپس آؤ گی تو خود ہی بتا دینا۔

آٹھ تاریخ کو میں اور عطی، پلی سے ذرا پیچھے اپنے مورچے پر شام چھ بجے سے ساڑھے چھ سات تک بیٹھے۔ عطی نے تمھارا پسندیدہ گانا کئی بار گنگنایا۔ پھر اُس نے ہم سب کی مشترکہ پسند کوئی دس بار گائی۔

آج تنہائی پھر کس ہمدم دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے، ساقی گری شام ڈھلے
منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب اُبھرے
اور ترا عکس جھلکنے لگے ہر سائے تلے

تم اِسی جگہ ہمارے ساتھ بیٹھ کر گنگنایا کرتی تھیں...... پھر مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے ان غزلوں اور گیتوں میں کوئی نئی بات نہیں۔ اِن میں کوئی ایسا حسن نہیں، جس کی بنا پر انھیں یاد رکھا جاسکے۔ ان کی ساری خوبصورتی ان کے ساتھ وابستہ یادیں ہیں۔ ان کے اصل معنی صرف اتنے سے ہیں......

۹ تاریخ کو تھوڑی بہت پڑھائی ہوتی رہی۔ شام کے وقت مورچے پر آئے۔ صبیحہ اپنی نئی سہیلیوں کے ساتھ مسکراتی ہوئی گزری۔ ان کے ساتھ یوں قہقہے برسا رہی تھی، جیسے تمھارے جانے کا اُسے ذرا بھی دُکھ نہیں۔ مجھے اتنا غصہ آیا۔ پھر سوچا میں بھی پاگل ہوں، چاہتا ہوں ہر کوئی تمھارے غم میں روتا پھرے۔

اتنے میں ناز گزری۔ فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بڑے زور سے اُس نے سلام مارا اور عطی سے مذاق کے بہانے چوٹ کرتی ہوئی گزر گئی۔ عطی اپنی جگہ سمجھتا ہے کہ میری پریشانی کا اصل سبب ناز ہے۔ کہہ رہا تھا۔ ''کنول واپس آئے تو میں اُسے ساتھ لے کر تمھارا اور ناز کا راضی نامہ کراؤں گا۔'' میں نے کہا ٹھیک ہے وہ واپس آئے تو اُس سے پوچھ لینا۔ ویسے تازہ خبر یہ ہے کہ (بالکل آج کی) ناز نے نسیم الرحمٰن کو بھی چھوڑ دیا ہے۔ خدا ہی اُسے سمجھائے۔

دوسری تازہ خبر سنو! اپنے کمانڈر صاحب بھی ہمارے والی سچوائشن میں پھنس گئے ہیں۔ سر کو

اُسترا لگوا لیا ہے۔ ذہن ٹھنڈا رکھنے کے لیے دن بھر نہر میں چھلانگیں لگاتے ہیں۔ لڑکی کا نکاح ہو چکا ہے اور جناب بھی کود پڑے ہیں۔ اب اس کے لیے بھی دعا کرنا تیسری خبر یہ ہے کہ شہلا سعید کی شادی جون میں ہونے والی ہے۔ آج ملی تھی تمھیں بہت یاد کر رہی تھی اور تمھارا پتہ مانگ رہی تھی۔

قاضی صاحب تمھیں بہت یاد کرتے ہیں۔ آج رات میرے پاس ہی تھے۔ پڑھائی کم اور تمھاری باتیں زیادہ ہوتی رہیں۔ آج کا پیپر اچھا ہو گیا۔ ڈیٹ شیٹ کے مطابق سات مئی کو آخری پرچہ تھا مگر 'آئین' کی وجہ سے ایک دو چھٹیاں آگئیں۔ اب آخری پرچہ ۲۱ مئی کو ہوگا۔ تمھارا نام لے کر لکھنا شروع کرتا ہوں ممتحن کچھ تو لاج رکھے ہی گا۔ تمھاری خواہش ہے نا، فرسٹ ڈویژن آئے۔ میں الفاظ کی کوکھ میں نئے معانی بھر دوں گا۔ مگر تم خدا کے لیے اپنے کہے پر قائم رہنا اور یہ نہ سوچنا، تم ۲۹ اپریل کو واپس آگئیں تو میری پڑھائی کا حرج ہوگا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اب ہونے کے لیے باقی بچا ہی کیا ہے؟ اب تو کوئی سانس ایسی نہیں آتی، جس میں تمھاری یادیں موجود نہ ہوں۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا، جس میں میری سسکیوں کی آواز شامل نہ ہو۔

تم اپنے گھر میں حالات ٹھیک کرنے کی کوشش کرنا، تاکہ بات شروع کرائی جا سکے۔ میں اپنے گھر خط لکھ دوں گا۔ لیکن پہلے تمھارا پتہ چلے۔ میرا خیال ہے آج کل ہی تمھارا خط آجائے گا۔ فلم دُھل گئی ہے۔ صرف چار پانچ فوٹو اچھے آئے، باقی خراب نکلے ہیں۔ تمھارا ایک فوٹو تو بہت ہی آفاقی قسم کا ہے، جس میں تم میری چادر لپیٹے شاہ جی والے سینما کی گیلری میں کھڑی ہو۔ وہ اس خط کے ساتھ ہی بھیج رہا ہوں۔ قاضی صاحب نے اس کے پیچھے ایک عنوان لکھ دیا ہے۔

رانجھن رانجھن کردی، میں تے آپے رانجھا ہوئی

اُن کا خیال ہے، تمھیں یہ عنوان پسند آئے گا۔ سعیدہ اور بوڑھی اُستانی والا فوٹو بھی ٹھیک آیا ہے۔ یہاں آؤ گی تو دیکھ لینا میں نے تمھارے لیے علیحدہ سے کاپیاں بنوالی ہیں۔

بہت سا پیار

تمھارا ہمیشہ

۱۴/اپریل ۱۹۷۳ء
انگریزی سے ترجمہ

راجہ صاحب

سلام!

اپنی بوجھل پلکوں کو دنیا کی نظروں سے چھپائے میں آٹھ تاریخ کی شام، اپنے گھر واپس پہنچی۔ خط دیر سے لکھنے کی معافی چاہتی ہوں۔ کیا کرتی۔ ابھی تک سکھ کا سانس لینا نصیب نہیں ہوا۔ گھریلو فضا انتہائی بور ہے۔ اِس گھٹے گھٹے ماحول کو اپنانے کے لیے بھی تو ایک عرصہ چاہیے۔

سنائیے آپ کی جانب صورت حال کیسی ہے؟؟؟ اب تک ایک پیپر ہو چکا ہوگا۔ کیسا ہوا؟ میں سمجھتی ہوں میں آپ کی مجرم ہوں۔ میری وجہ سے آپ بالکل نہیں پڑھ سکے۔ ذرا بھی تو تیاری نہیں تھی۔ خدا (جیسے آپ لاشعوری طور پر مانتے ہیں) سے میری دعا ہے وہ آپ کو کامیاب و کامران کرے۔ ورنہ میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کرسکوں گی۔

شفی (مجھ سے چھوٹی والی) کسی سہیلی کی شادی میں شریک ہونے کے لیے کل صبح لاہور جارہی ہے۔ میں یہ خط اُسی کے ہاتھ بجھوا رہی ہوں۔ وہ لاہور سے پوسٹ کرے گی۔ ویسے حیران ہورہی تھی کہ مجھے یہاں پہنچتے ہی آپ کو خط لکھنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟

یوں تو آپ سے واقف ہے مگر میں نے ابھی اُسے کچھ نہیں بتایا۔ میرا خیال ہے وہ خود ہی اندازہ لگالے گی۔ گھر میں کسی کو نہیں بتاسکی کہ میرے سمسٹر میں سے ایک پیپر باقی رہتا ہے۔ گھر والوں سے کیسے بات کروں۔ تین سال یونیورسٹی میں رہی، پھر بھی کورس مکمل نہ کرسکی۔ مجھے بتائیے اس سلسلے میں کیا کروں؟ آپ امتحانوں میں بہت مصروف ہوں گے۔ لیکن چند منٹ نکال کر میرے ڈیپارٹمنٹ میں جاسکیں تو شیخ صاحب سے معلومات حاصل ہوسکتی ہیں۔ پتہ کرادیں، اس پیپر کی کلاسیں کب سے شروع ہورہی ہیں۔ مضمون کا نام ہے ''پاکستان میں تعلیم''۔

سنائیے اب تک دل کچھ لگا ہے یا نہیں۔ میں محسوس کر سکتی ہوں آپ کس قدر پریشان ہوں گے۔ کاش میں آپ کے قریب ہوتی! ویسے حالت اپنی بھی بہت بُری ہے۔ یہاں ابھی تک سکوتِ مرگ ایسی خاموشی ہے۔ جو آنے والے کسی طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ میں ایک ایسے آتش فشاں پر کھڑی ہوں جس کا دہانہ کسی لمحے بھی پھٹ سکتا ہے۔ آنکھیں بند کیے ہر وقت خدا سے دعا مانگتی رہتی ہوں۔ میری خالہ بہت چکر لگا رہی ہیں۔ ایک دن اُن کا بیٹا بھی ساتھ آیا تھا۔ اُس آدمی کی آنکھوں سے اجنبی قسم کی چمک پھوٹتے دیکھ کر میں تو کانپ ہی گئی۔ شاید، وہ پہلا مرد ہے، جسے دیکھ کر میں خوف زدہ ہو جاتی ہوں۔ ورنہ آپ جانتے ہی ہیں۔

لاہور بہت یاد آتا ہے خاص کر نیو کیمپس کی شام، جب ہم لوگ اکٹھے پھرا کرتے تھے۔ جانتی ہوں، ماضی کے خوابوں میں کھوئے رہنے سے کچھ حاصل نہیں، لیکن کیا کروں میری بہت سی قیمتی یادیں اور انمول دن ماضی کی تہوں میں کھو گئے ہیں۔ اس خزانے کو میں کیوں کر بھلا دوں؟

اِس وقت رات کا ایک بجا ہے۔ خط لکھنے سے پہلے میں آپ کی جیل والی کتاب پڑھ رہی تھی۔ ابھی بھی میرے تکیے کے نیچے رکھی ہے۔ اپنے کمرے میں اکیلی ہوں۔ جانتے ہیں، کون سے کپڑے پہن رکھے ہیں۔...... آپ والے......

آپ مجھ سے بہت دُور ہیں۔ لیکن یہ کپڑے پہن کر مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے آپ میرا لباس بن کر میرے قریب ہوں اور میرے دل کی دھڑکنوں کو کان لگا کر سن رہے ہوں۔ اوہ خدایا! آپ کتنے یاد آ رہے ہیں۔

میں جس بات کا اظہار نہ کر سکی، آج میں اُس کا کھل کر اعتراف کرنا چاہتی ہوں۔ سُنیے راجہ صاحب! میں آپ سے پیار کرتی ہوں۔ بہت ہی زیادہ پیار کرتی ہوں۔ مجھے کچھ علم نہیں کل کیا ہوگا؟ لیکن میرا پیار ہمیشہ یاد رکھیے گا۔ میرے اس اعتراف کو کبھی فراموش نہ کیجئے گا۔

اجازت دیجئے۔

ڈھیروں پیار

صرف آپ کی کنول

۱۹/اپریل ۱۹۷۳ء
انگریزی سے ترجمہ

راجہ صاحب

سلام!

آج شام ایک ناول پڑھ رہی تھی۔ کچھ کچھ ہم سی سچوائشن پیدا ہو گئی۔ یقین کیجئے، میں اپنے آپ کو سنبھال نہ سکی۔ سسکیوں کی آواز سن کر امی دوڑتی ہوئی پہنچیں۔ سبھی لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اور پوچھنے لگے "کیا ہو رہا ہے، کہیے نا......" انھیں کیا بتاتی؟

کل رات ہم لوگ اپنے کچھ رشتہ داروں کے ہاں کھانے پر مدعو تھے۔ ٹی وی پر طارق عزیز موسیقی کا کوئی پروگرام پیش کر رہا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ سارا منظر پھیل گیا جب ہم شوٹنگ دیکھنے اُس کے سیٹ پر گئے تھے۔ یاد ہے اُس نے شعر سنایا تھا۔

جو ہویا ایہہ ہونا ای سی، تے ہونی ہونیوں رکدی نہیں
اک واری شروع ہو جائے، تے گل فیر اویں مکدی نہیں

کہاں ختم ہوتی ہے پھر! انسان اپنی سوچوں کا محتاج بن کر رہ جاتا ہے۔ میں نے اس ہنستی بستی محفل میں بڑی مشکل سے بھیگتی آنکھیں خشک کیں، سبھی لوگ میرے درد سے بے خبر ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ دعوت پر میرے کئی کزن موجود تھے۔ ان میں سے ایک دو گورڈن کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔ باتوں میں یونیورسٹی پالیٹکس کا ذکر چلا، کسی نے فوراً آپ کا نام لیا۔ یہاں پر موجود سبھی لوگ آپ کو جانتے تھے۔ پھر آپ کے مستقبل پر بحث شروع ہو گئی۔ میں نے انھیں بتایا کہ "وہ تعلیم کے لیے باہر جا رہے ہیں۔" ایک لڑکا تو آپ کا بہت معترف لگتا تھا۔ کہنے لگا "وہ بہت بڑا آدمی بنے گا۔ وہ انتہائی ذہین بھی ہے اور بہت اچھا مقرر بھی۔" میں نے دل ہی میں کہا "نادان لڑکے! مجھ سے پوچھ وہ کتنے پیارے مقرر ہیں۔" جب یہ سارے لوگ آپ کی تعریف کر رہے تھے تو میں

اتنی خوش تھی کیا بتاؤں ...... میں نے سوچا انھیں کیا پتہ، وہ جس شخص کی باتیں کر رہے ہیں، وہ تو خود یہاں بیٹھا ہے میرے دل کے اندر۔

میری شادی کے متعلق تیز اور نوکیلی سانسوں کی آواز میں سرگوشیاں جاری ہیں تاہم مجھے دیکھتے ہی بات پلٹ دی جاتی ہے۔ میری خالہ زاد بہن نے ایک دن مجھ سے پوچھا ''تعلیم تو ہو چکی اب آئندہ کا کیا پروگرام ہے؟'' میں نے کہا ''ایک سال تک آرام کرنا چاہتی ہوں پورا ایک سال۔''

یہاں سے نجات کا صرف ایک ہی راستہ تھا کہ میں وقتی طور پر کہیں ملازمت کر لیتی۔ مگر مجبور ہوں۔ کاش میں نے اپنا کورس ہی مکمل کر لیا ہوتا! اس عالم میں ملازمت کے متعلق سوچنا ہی بے کار ہے۔ یہاں موسم بہت خوشگوار ہے۔ اِس وقت بھی باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی ہے۔ لاہور تو میرے ذہن کی مانند جل رہا ہوگا۔ مگر موسم بھی جبھی اچھے لگتے ہیں، جب آدمی کا اپنا ذہن مطمئن ہو۔ میں اِس خوشگوار فضا کو کیا کروں جہاں میں کوئلے کی طرح دہک رہی ہوں۔ پھر مجھے دن بھر ایکٹنگ کرنا پڑتی ہے کہ میں اِس جگہ واپس آ کر بہت خوش ہوں اور مجھے کوئی تکلیف نہیں وغیرہ وغیرہ۔ بعض اوقات مجھے انتہائی پریشان حالت میں بھی یہی بہروپ بھرنا پڑتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ایک دن چلا چلا کر انھیں بتاؤں ''میں بہت اُداس ہوں۔''

کل رات میں نے خواب دیکھا۔ آپ میرے پاس لیٹے تھے۔ صبح جاگی تو محسوس ہوا جیسے آپ واقعی یہاں آئے ہوں۔ بتاتے ہوئے شرم آ رہی ہے...... بالکل حقیقت جیسا خواب تھا۔ میں کافی دیر تک آنکھیں بند کیے سوچتی رہی۔ میں بار بار اِسی نتیجے پر پہنچی کہ آپ سے بڑھ کر مجھے کوئی عزیز نہیں ہے۔ آپ نے مجھے زندگی کی گہرائیوں سے ہلا دیا ہے، کوئی یہاں تک نہ پہنچ سکے گا۔

میں کتنی مضبوط دل عورت تھی۔ لیکن حالات نے میرے تین حصے کر دیئے ہیں۔ ایک جانب میرا خاندان، ماں باپ اور میرا منگیتر ہے۔ دوسری جانب خرم، جس کا میرا کئی سالوں کا ساتھ ہے اور تیسری جانب ایک ایسا شخص ہے، جس کے ساتھ میری قربت کی داستان اتنی طویل تو نہیں مگر یوں لگتا ہے جیسے صدیوں سے اُسی کی منتظر تھی۔ وہ مجھے مشکل کے بعد ملا ہے اور اُسے حاصل کرنا شاید اس سے بھی زیادہ مشکل ہو...... اس لیے کہ وہ دنیا والوں کے معیار سے بہت آگے ہے۔ کاش وہ اتنا آگے نہ ہوتا، یا پھر میں اتنا پیچھے نہ ہوتی...... ہاں لیکن پھر وہ ''وہ'' کیسے ہوتا؟

آپ کے ساتھ رہ کر مجھے بھی فلسفے کا دورہ پڑ گیا ہے۔ دیکھ لیجیے، صحبت کا اثر ہے۔ راجہ صاحب! میں اپنے آپ کو جوڑنا چاہتی ہوں۔ میں ایک ہونے کے لیے جنگ کر رہی ہوں۔ دعا کیجیے، میں کامیاب ہوسکوں۔ میں اپنے بٹے وجود کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتی۔ مجھے آپ کی باتیں اب یاد آتی ہیں۔ آپ مستقبل سے باخبر تھے، جبھی اتنے کھوئے کھوئے رہتے تھے۔ میں بے خبر کیمپس کی شاہراہوں پر زندگی ڈھونڈتی پھری۔ مجھے احساس ہے، ان ساری جگہوں سے اکیلے گزرنا آسان نہیں، جہاں کبھی ہم آپ بیٹھا کرتے تھے۔ شاہ جی والا سینما تو ایسی جگہ ہے، جہاں بہت سے حسین لمحات گزرے ہیں۔ بھلا میں اُس صوفے اور کمرے کو کیوں کر بھلا سکتی ہوں؟ آپ اس قدر جذباتی باتیں لکھتے ہیں، جو مجھے بار بار رُلا دیتی ہیں اور یہاں کوئی نہیں، جس سے یہ سب کچھ دہرا کر دل کا بوجھ ہلکا کر سکوں۔ شام کے وقت مورچہ باقاعدگی سے جمتا ہوگا؟ عطی صاحب کے کیا حال ہیں؟ صبیحہ وغیرہ کو سلام کہہ دیں۔ آپ کے خط باقاعدگی سے مل رہے ہیں۔ یہاں سے بھیجتے وقت مجھے ذرا پریشانی ہوتی ہے۔ بوائز ہاسٹل کی بجائے آپ کے ڈیپارٹمنٹ کا پتہ پر خط لکھ دوں، تو میرے لیے آسانی ہو جائے گی۔ آپ بُرا نہ منائیں تو لفافے پر انجم راجہ، کے نام سے پتہ لکھ دیا کروں۔ مجھے دوسروں کے ہاتھ خط پوسٹ کروانا پڑتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی اسے کھول کر پڑھتا پھرے۔ پوسٹ مین سے کہہ دیں تو مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ میں پروگرام کے مطابق اپریل کے آخر یا مئی کے پہلے ہفتے میں لاہور آؤں گی۔ ابھی تک ڈیٹ فکس نہیں ہوئی۔ شاید امی بھی ساتھ ہوں۔ مگر میں نے کیمپس ہی میں ٹھہرنا ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ دیکھئے اب تو میں خشک خط نہیں لکھتی۔ اُمید ہے آپ کو یہ شکایت نہ ہوگی۔ خرم کو بھی آپ کے ساتھ ہی خط لکھ رہی ہوں۔ (بُرا نہ منائیے گا) شاید اُس کی ٹرانسفر جلد ہی راولپنڈی ہو جائے۔

ڈھیروں پیار

ہمیشہ آپ کی

۲۲/اپریل ۷۳ء۱۹
انگریزی سے ترجمہ

راجہ صاحب

اوخدایا! میں کتنی تنہا ہوں اور کس قدر مایوس بھی۔ تاریک رات...... خاموش ہوا...... اور گہرا سکوت، یوں لگتا ہے جیسے گردشِ دوراں ساری کائنات سمیت عدم کی پہنائیوں میں گم ہوگئی ہو۔ لیکن میری رُوح پلکوں پر اٹکے آنسو کی مانند بے چین ہے۔ ادھوری تمنائیں، مجبور خواہشیں اور روتی آرزوئیں۔ جنم جنم کی کوئی ایسی بھوک میرے اندر کروٹیں لے رہی ہے، جسے جاننے سے میں قاصر ہوں۔

یوں تو میں تنہا ہوں، لیکن حسین یادیں میرے پہلو میں لیٹی ہیں۔ میرے حواس پر ان کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے۔ اُف! یہ یادیں بھی تو اندھے کنوئیں ہیں، جن میں گرنے والے کبھی تہ تک نہیں پہنچ پاتے۔ یا پھر کسی یخ بستہ صبح کے آخری خواب کی طرح ہیں، جسے دیکھنے والے بیدار نہیں ہونا چاہتے۔ میری آنکھیں یادوں کے بوجھ تلے بند ہوئی جاتی ہیں۔ سوچتی ہوں وہ لمحات جو یادیں جنم دیا کرتے ہیں، جانے پھر کب لوٹیں۔

بکھرے خیالوں کی رنگین دنیا میں بار بار کھو جاتی ہوں۔ کہیں دُور سے پیار کی زندہ لہریں دھیمے دھیمے تال پر پھوٹ رہی ہیں۔ میں جیسے ان آوازوں کے سحر میں مخمور اور مدہوش ہو جاتی ہوں۔ میں آہستہ آہستہ ڈوب رہی ہوں۔ پھر اچانک مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں اکیلی ہوں، میرے اردگرد سکوت، اندھیرا اور پیاس! کوئی دوست کوئی دشمن میرے قریب نہیں...... ہاں مگر تنہائی اور یادیں۔

آپ تو میری سوچوں کے حکمران ہیں۔ آپ نے مجھے پیار کے حیات آفرین لمس سے آشنا کیا ہے۔ آپ کی گہری باتیں، دوستانہ مشورے، خوبصورت الفاظ اور پیار میرے وجود کا حصہ بن گئے

ہیں۔آپ کا غم زدہ چہرہ میری ذات کی گہرائیوں میں محفوظ ہے۔آپ نے مجھے اتنا کچھ دیا۔ لاکھ چاہوں تو بھی لوٹا نہیں سکتی۔میں خوش نصیب تھی،آپ جیسے انسان نے میری قدر کی اور پھر مجھے خیال آتا ہے،خوشیاں کتنی جلد اندھیروں میں بھٹک جاتی ہیں۔سب کچھ بیت گیا ہے اور میرے پاس صرف یادیں رہ گئی ہیں۔مجھے یقین ہے کہ کسی دن کسی موڑ پر ہم ضرور اکٹھے ہوں گے۔دل کے رِستے زخم ایک نہ ایک دن مندمل ہوں گے۔

تب تک کے لیے ڈھیروں پیار

کنول آپ کی

۲۶/اپریل ۱۹۷۳ء

راجہ صاحب

سلام!

آج آپ کے چار خط ملے۔ تین نئے ایڈریس پر تھے اور چوتھا میرے پرانے پتے پر۔ پلیز مجھے فوراً لکھیے نئے پتے پر آپ نے کتنے خط بھیجے ہیں۔ دو خط کھلے ہوئے ملے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے کئی لوگوں نے انھیں پڑھا ہے۔ ابھی تک کوئی ایسی بات تو نہیں ہوئی، پھر بھی آئندہ کے لیے احتیاط کر لینی چاہیے۔ یوں کریں لفافے پر شفی کا نام کیپیٹل حروف میں لکھ دیا کریں اور اندر میرے نام کی بجائے صرف، ہیلو کافی ہے اور دوسری ضروری بات، ایڈریس انگریزی میں لکھا کریں۔ آپ کی لکھائی یہاں سب لوگ پہچان لیتے ہیں۔ یوں بھی خاصی مردانہ لکھائی ہے۔ سبھی کو شک ہوتا ہوگا۔ خاص کر خرم کے متعلق تو بہت سی افواہیں یہاں گھوم رہی ہیں۔ (آپ کے بارے میں صرف شفی کو علم ہے) میرا خیال ہے آپ کے خطوں کو جبھی وہ کھولنے کے درپے رہتے ہیں۔ سوچتے ہوں گے، خرم کے خط ہیں۔

میں اس خالہ کا کیا کروں، ہر وقت میری امی کے کان بھرتی رہتی ہے۔ اُس نے جیسے لاہور کی ساری باتوں کا ریکارڈر کھا ہوا ہے۔ امی کو یہاں تک بتایا ہے "تمھاری بیٹی، فلاں دن لڑکوں اور لڑکیوں کے ایک گروپ کے ساتھ رات گئے تک باہر پھرتی رہی۔ فلاں روز فلم پر گئی۔" امی یہ سب کچھ سن کر مجھ سے ناراض سی رہتی ہیں۔ پہلے پہل ڈیڈی ٹھیک تھے، لیکن اب ان کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے، جیسے ان تک یہ معلومات پہنچائی جا رہی ہیں۔

ایک دن ڈیڈی کہہ رہے تھے "تعلیمی اداروں کی فضا بہت گندی ہے۔ طلبا پڑھنے کی بجائے آوارہ گردی کرتے ہیں۔ دہریت کی باتیں کھلے عام ہو گئی ہیں۔ کچھ لوگ اپنے آپ کو 'سوشلسٹ' کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ان لوگوں سے بچنا ہی چاہیے۔" میں تو حیران ہی رہ گئی۔ جیسے

کسی نے خاص طور پر آپ کے متعلق بتایا ہے۔ پہلے انہوں نے کبھی ایسی بات نہیں کی تھی۔ راجہ صاحب آپ ٹھیک کہا کرتے تھے، واقعی اِن لوگوں کے ذہن پر خاندان، بڑائی، عزت اور وقار کی جھوٹی باتیں قبضہ جمائے بیٹھی ہیں۔ یہاں سوائے پیار کے ہر شے جائز ہے۔ محسوس کرتی ہوں، جیسے میں کسی غلط جگہ پیدا ہوگئی ہوں۔ اپنے ناموس کی خاطر اپنی اولاد کو ذبح کر دینا، یہاں کا دستور ہے۔ میں ایک ناتواں عورت! ان سے کیسے لڑوں گی اور کب تک؟ میں تو یہی سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جاتی ہوں۔ میرے پاس دعا اور انتظار کے سوا رکھا ہی کیا ہے۔

شکر ہے آپ کے تین پیپرز اچھے ہو گئے۔ چوتھے کی خوب تیاری کریں۔ آپ کی بڑی ہمت ہے۔ خدا کے لیے ڈھیلا نہ پڑیئے گا۔ یہ کیا باہر جانے کا پروگرام کیوں ترک کر دیا؟ آپ کو میری قسم اِس طرح نہ کریں۔ بہت ممکن ہے آپ کے باہر جانے سے کوئی بہتر صورت پیدا ہو جائے۔ آپ میرے لیے گفٹ کیوں خریدتے رہتے ہیں؟ مجھے آپ کے سوا کسی چیز کی کمی نہیں۔ پھر پیسے فضول پھینکنے سے فائدہ؟ کیوں بار بار مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ آپ نے مجھ سے صرف ایک گفٹ لیا اور وہ بھی سادہ سے اسٹڈ۔ کوئی اور چیز دوں، آپ لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ بتا رہی ہوں، اب میں نے کوئی گفٹ نہیں لینا۔ پلیز ناراض مت ہوں۔

عطی صاحب کو کتے نے کاٹ کھایا تو آپ فوراً اُس غریب کتے کو تلاش کریں باؤلا نہ ہو گیا ہو! ویسے میری طرف سے اُس کو پوچھ دیجئے گا۔

ڈھیروں پیار

آپ کی کنول

۲۹/اپریل ۱۹۷۳ء
انگریزی سے ترجمہ

راجہ صاحب

غضب ہوگیا! مجھے پہلے ہی پتہ تھا، ایک نہ ایک دن یہی ہونا ہے۔ کل آپ کا خط جانے کیسے ڈیڈی کے ہاتھ لگ گیا...... آپ اندازہ لگا سکتے ہیں، اس کے بعد کیا قیامت آئی ہوگی؟ انھوں نے فوراً امی کو بلایا اور خط اُن کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا ''یہ سب کیا ہے۔'' امی کے منہ سے نکل گیا ''یہ کسی لڑکے کی شیطانی ہے۔ اس سے پہلے بھی اس قسم کے دو خط میں نے دیکھے ہیں۔'' ڈیڈی نے کہا، ''وہ خط بھی فوراً لاؤ۔'' میں مجبوراً اُٹھی اور انھیں خط دے دیے۔ (یہ وہی دونوں خط تھے جو مجھے کھلے ہوئے ملے تھے۔ شاید امی نے انھیں پڑھا تھا) ایک خط میں آپ نے میرے کورس کے متعلق تفصیلات بھیجی تھیں اور مجھے فارم پُر کرنے کے لیے کہا تھا۔ میں نے کہہ دیا ''فارن سکالرشپ کے لیے یہ کورس ضروری ہوتا ہے۔ میرے ایک کلاس فیلو نے مجھے اس کی اطلاع کے لیے خط لکھا ہے۔'' انھوں نے پوچھا ''اُس لڑکے کا نام؟'' میرے منہ سے نعیم نکل گیا۔ ڈیڈی کہہ رہے تھے ''میں تمھارے ہیڈ کو اُس لڑکے کے متعلق لکھ رہا ہوں کہ اس نے یہ حرکت کی ہے۔'' خدا کے لیے ان کی چٹھی وہاں تک نہ پہنچنے دیں۔ وہ نعیم غریب خواہ مخواہ مارا جائے گا۔

ڈیڈی تو غصے سے دیوانے ہو رہے تھے۔ مجھے ڈانٹتے ہوئے کہنے لگے ''تم نے لڑکے کو اس قسم کے ذلیل خط لکھنے کی اجازت کیوں دی؟'' ایک خط میں شفی کا ذکر بھی تھا۔ وہ غریب خواہ مخواہ ماری گئی، دیکھیے نا؟ اس کا کیا قصور؟

شفی کو بھی بہت ڈانٹ پڑی۔ مجھ سے اتنی ناراض ہو رہی تھی۔ کہہ رہی تھی ''تم خرم کی وجہ سے پہلے ہی کتنی پریشان تھیں، اُوپر سے تم نے ایک اور سلسلہ بھی چلا دیا۔ اب خراب ہوتی رہو۔'' وہ ٹھیک ہی کہتی ہے۔ یا تو اُس وقت پاگل تھی اور اگر نہیں تھی تو اب ضرور ہو جاؤں گی۔ کاش میں

کیمپس نہ گئی ہوتی! مجھے اپنے لیے کوئی راہ نہیں چننی چاہیے تھی۔ 'فرماں بردار' بیٹی کی طرح مجھے کچھ نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ میں بہت پریشان ہوں۔

اِن حالات میں میرا لاہور آنا ممکن نہیں رہا ہے۔ شاید ڈیڈی ہی آجائیں گے۔ آپ مجھے خط نہ لکھیے۔ اگر کسی کے ہاتھ پھر آ گیا تو میں زندہ رہنے کے قابل نہ رہ سکوں گی۔ جب بھی ممکن ہوا میں آپ کو لکھتی رہا کروں گی۔ خط دیر سے آئے تو بھی پریشان نہ ہوں۔ یاد رکھیں آپ کو ہر حال میں فرسٹ ڈویژن حاصل کرنی ہے۔

ڈھیروں پیار

کنول

۲/جون ۱۹۷۳ء

انگریزی سے ترجمہ

راجہ صاحب

سلام!

آپ کو لکھے ایک زمانہ بیت گیا۔ کبھی کبھار آپ کی خیریت کی اطلاع ملتی رہی۔ صبیحہ کا ایک خط آیا تھا۔ پتہ چلا آپ شدید بیمار ہیں۔ میں بہت فکر مند رہی۔ کوئی ہفتہ بھر پہلے میری سہیلی سائرہ، اپنے خاوند کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ (دونوں ہنی مون کے لیے جاتے ہوئے ہمارے پاس ایک رات کے لیے ٹھہرے تھے۔) اُس نے بتایا آپ کیفے ٹیریا کے ایک کونے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ آپ چائے پر بیٹھے تھے، تو جان لیا کہ ابھی تک زندہ ہیں۔ میں نے آپ کی صحت یابی کے لیے بہت دعائیں مانگیں۔ خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔

آپ کے خط ہی تو میرا بہترین سرمایہ تھے۔ اب نہیں آتے، تو جیسے زندگی میں ایک خلا پیدا ہو گیا ہے۔ مجبوری بھی کیا ظالم شے ہے، وہی چیز چھین لیتی ہے...... جو ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہو۔

وہ خط والے قصے کا اب پتہ چل گیا ہے۔ آپ کا خط ایک منصوبے کے تحت ڈیڈی تک پہنچایا گیا تھا۔ یہ سب پلاننگ میری چھوٹی خالہ نے کی۔ امی اور بڑی خالہ بھی اس نیک کام میں اپنی بہن کے ساتھ شامل تھیں۔ مجھ سے پہلے بھی ان لوگوں نے اپنے خاندان کی ایک لڑکی کا افیئر اِسی طرح ناکام کرایا تھا۔ اُس لڑکی کی شادی اپنے ایک کزن کے ساتھ کروادی تھی...... اور اب 'وہی لڑکی' ہر عورت سے اپنی ناکامی کا انتقام لینا چاہتی ہے۔ جانتے ہیں وہ لڑکی کون تھی؟ یہی میری چھوٹی خالہ!

اِن لوگوں کا منصوبہ یہ تھا کہ اِس طرح مجھے ڈیڈی کی نظروں میں رُسوا کر دیا جائے، تو وہ

میری شادی فوراً میرے کزن سے کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ بلکہ اُلٹے احسان مند ہوں گے کہ اُن کی 'خراب' بیٹی بھی ٹھکانے لگ گئی ہے۔ اِس حد تک اُن کا پلان کامیاب ہو گیا ہے کہ ڈیڈی اور ہم بہنوں کے درمیان نفرتوں کی خلیج حائل ہو چکی ہے۔

ڈیڈی پرانی وضع کے آدمی ہیں، انھیں اِس بات کا بہت صدمہ پہنچا ہے۔ اُن کی آنکھیں زمین کو لگ گئی ہیں۔ ہر وقت سوچوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ میں سوائے شفی کے کسی سے بات نہیں کرتی۔ یوں لگتا ہے، جیسے اس گھر میں اجنبی ہوں۔ باہر آنا جانا بالکل بند کر دیا ہے۔ اتنی بدل گئی ہوں، آپ بھی شاید پہچان نہ سکیں۔ شفی کا خدا بھلا کرے، وہ نہ ہوتی تو میں زندہ نہ بچتی۔

اب ماضی پر غور کرتی ہوں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ غلطی میری تھی۔ مجھے آپ سے وعدے نہیں کرنے چاہئیں تھے۔ میں تین بار جنم لوں تو بھی اس گھر کے لوگوں کو وہ باتیں نہیں سمجھا سکتی، جو آپ سوچتے یا کرتے ہیں۔ فرض کیجیے میری منگنی ٹوٹ بھی گئی، تو ان لوگوں کا پہلا سوال ہوگا ''لڑکا کس عہدے پر ہے؟''

آپ کو بھلانا آسان نہیں۔ میں المیہ گیت سن سکتی ہوں، کوئی ایسا ناول پڑھ سکتی ہوں اور نہ ٹریجک فلم دیکھ سکتی ہوں۔ راتوں کو سوتے ہوئے کانپ کر بیدار ہو جاتی ہوں۔ مجھے میرا ضمیر چین نہیں لینے دیتا۔ میں نے آپ کو ختم کر دیا ہے۔ ایک ایسے انسان کو جلا دیا، جس نے مجھ پر بہت احسان کیے تھے۔ تاہم تقدیر سے کیا شکوہ؟ وہ کسی نے کہا ہے ''آئیڈیل ایک ایسی منزل ہے، جس پر کوئی نہیں پہنچ سکتا۔'' آپ میرا 'آئیڈیل' ہیں۔ شاید میں آپ تک کبھی نہ پہنچ سکوں۔

مجھے صرف ایک خط لکھیے اور بس۔ اپنا مستقل پتہ ضرور لکھیے۔ (اگرچہ بے فائدہ) آئندہ کا پروگرام۔ (بے فائدہ) لاہور کب تک رہنے کا پروگرام ہے (پھر بے فائدہ)......

مجھے پتہ چلا ہے آپ کسی لڑکی کے ساتھ بہت پھرتے ہیں۔ میں نہیں چاہتی آپ 'اُس لڑکی' کے ساتھ پھریں۔ ہو سکتا ہے میں یہ بات رقابت کے تحت کہہ رہی ہوں۔ میں آپ پر اپنا حق جتا رہی

ہوں۔ میں تو جیسے نفسیاتی مریض بن گئی ہوں۔ آپ اور میں اب دو مختلف انسان ہیں۔ (کتنا تکلیف ده تصور ہے)

میں ہار گئی ہوں، مجھے معاف کر دیجئے گا۔

آخری بار بہت سا پیار

کنول

۱۵/اگست ۱۹۷۳ء

انگریزی سے ترجمہ

راجہ صاحب

اگر میرا ماموں زاد بھائی راولپنڈی سے بھاگا بھاگا میرے پاس نہ آیا ہوتا، تو میں یہ خط نہ لکھتی۔ پرسوں کہیں وہ آپ سے ملا اور پھر سیدھا میرے پاس پہنچا۔ اُس نے آتے ہی تقریر شروع کردی ''تم نے دھوکا دیا ہے۔ تم نے ظلم کیا ہے۔ تم بے حس ہو۔ تم نے ایک آدمی کو قتل کیا ہے۔''
آپ تو جانتے ہیں وہ آپ کا کتنا فدائی ہے۔ اندازہ کر لیجیے کہ اُس نے مجھے کیا کچھ نہیں کہا ہوگا؟

تاہم میں نے اُس کے سامنے کچھ بھی تسلیم نہیں کیا۔ میں نے کہا، ''میرا آپ کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا۔ عام جان پہچان تھی۔ الیکشن وغیرہ میں اکٹھے کام کیا۔ شاید آپ کسی غلط فہمی کا شکار ہوگئے۔'' میں نے اُسے بتایا کہ پاکستانی لڑکوں کی نفسیات ہی خراب ہے۔ ذرا سی ہنس کر بات کرو، وہیں عاشق ہو جاتے ہیں۔ جب وہ یہ سب کچھ آپ کو بتائے گا، تو آپ کو کتنی تکلیف ہوگی! خدا کرے اُس کے ملنے سے قبل میرا یہ خط آپ تک پہنچ جائے۔

اُس نے مجھے بتایا، آپ پہلے سے بھی بہت دُبلے ہو گئے ہیں۔ اللہ، آپ پہلے ہی کتنے دُبلے تھے! اپنی صحت کا خیال کیوں نہیں رکھتے؟ سگریٹ کم پیا کریں، چائے چھوڑ دیں، رات کو جلدی سو جایا کریں، کھانا وقت پر کھایا کریں۔

زندگی حوادث کا مجموعہ ہے۔ ایک حادثہ تھا کہ ہم ملے اور ایک حادثہ ہے کہ بچھڑ گئے۔ بعض اوقات انسان جو کام ہنسی کھیل میں شروع کرتا ہے، تقدیر اُس کے انجام پر انسان کو اکثر رُلا دیتی ہے۔ ہماری کہانی کی یہی ابتدا تھی اور یہی اس کا انجام۔

میں نے وہی کچھ کیا، جو اِن حالات میں ممکن تھا۔ تقدیر ہمیں مختلف راہوں کا مسافر بنا چکی ہے، لیکن یہ ساری باتیں دہرا کر میں آپ کو اور پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ آپ مجھے بھلانے کی

کوشش کیجیے، اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں......لیکن خدارا اپنے آپ کو تباہ نہ کیجیے۔ کیا ہم پہلے ہی بہت رُسوا نہیں ہو چکے؟ میری دعا ہے خدا آپ کو سکون دے اور آپ کا مستقبل بہتر بنائے۔ میں جانتی ہوں آپ میں کتنی قوت برداشت اور کتنا حوصلہ ہے۔ آپ کو یہ سب کچھ خندہ پیشانی سے برداشت کرنا چاہیے۔

میں ایک بار پھر آپ سے معافی کی درخواست کرتی ہوں۔ یہ جانتے ہوئے کہ غلطی میری تھی......میں نے آپ سے وہ وعدے کیے، جنھیں میں نہ نبھا سکی۔ میں نے آپ کو......وہ اُمیدیں دلائیں، جن پر میں خود پوری نہ اُتر سکی......لیکن جو ہونا تھا، وہ ہو چکا اب ان باتوں سے کیا حاصل؟

پلیز اس خط کا جواب نہ دیجیے گا......

کنول (جو کبھی آپ کی تھی)

۱۹/۱ اکتوبر ۱۹۷۳ء

راولپنڈی

کنول

کسی جنم میں ہمارا تمھارا ساتھ تھا۔ میں نے سنا ہے پچھلے جنم کی باتیں یاد نہیں رہا کرتیں۔ ہو سکتا ہے تمھیں بھی کچھ یاد نہ آسکے، اُس زندگی میں ایک بار تم نے کہا تھا ''آپ فرسٹ ڈویژن لیں تو پوری دنیا کے سامنے......'' خیر چھوڑو اِس قصے کو، بھلا بوجھو تو میری کون سی ڈویژن آئی ہوگی؟

صرف فرسٹ ڈویژن ہی نہیں...... بلکہ پوری یونیورسٹی میں میری فرسٹ پوزیشن آئی ہے۔

یہ خبر ملی تو میں نے سوچا تم بھی کتنی بدقسمت تھیں، مجھ ایسے آدمی سے صرف اتنا کچھ ہی چاہا!!!

ہاں یہ چار مہینے بہت کٹھن تھے۔ ان دنوں کی ساری جزئیات میں جانا میرے لیے ممکن نہیں۔ صرف یہ جان لو کہ تم کو ذہن سے باہر پھینکنے کی جستجو میں میرے سر کے آدھے بال سفید ہو گئے۔ زندہ رہنے کے لیے اپنے آپ کو نئے سرے سے ڈھونڈنا پڑا۔

تمھارا آخری خط ملنے سے پہلے میں ہر شام تمھیں ایک طویل خط لکھا کرتا تھا۔ میرے پاس ان خطوں کا ایک ڈھیر پڑا ہے۔ سوچا تھا کبھی ملو گی تو دوں گا۔ میں بھی کتنا سادہ دل تھا! پھر ایک دن میں اور پرویز رشید تمھاری تلاش میں مری پہنچے۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ تم ضرور مفلسی میں زندگی گزارنے پر آمادہ ہو جاؤ گی۔ ہم پورا دن تمھیں ڈھونڈتے پھرے۔ تھک ہار کر مال کے ایک کونے میں جا بیٹھے۔ بیس پچیس منٹ کی طویل خاموشی کے بعد پرویز نے اچانک مجھ سے پوچھا ''آج جمعرات ہے؟'' میں نے جواب دیا ''ہاں۔'' اُس نے سر پر ہاتھ مارا ''منحوس دن کام کیسے بنتا؟'' باقی چھ دن میرے لیے بُرے ثابت ہوئے۔ یوں ہم نے پورا ہفتہ نحوست منایا اور بلندیوں سے نیچے اُتر آئے۔

جس دن تمھارا خط ملا، میں لاہور میں تھا۔ ساتھی مجھے بہلانے کے لیے فلم پر لے گئے۔

وہاں تمھاری سہیلی سعیدہ بیٹھی تھی۔ تم اور بھی شدت سے یاد آئیں۔ فلم سے نجات ملی تو قوم نے صنم سینما کے سامنے تکوں کی دکان پر ہلہ بول دیا۔ یہیں سے میں تمھارے لیے پھولوں کے گجرے خریدا کرتا تھا۔ پھول بیچنے والا جب آواز لگاتا، میرے سامنے تمھاری کلائی آجاتی۔ میں نے پاس بیٹھے طارق سلطان سے پوچھا ''کوئی شخص تیس منٹ میں پینتیس بار یاد آئے تو کیا زندہ رہنا ممکن ہے؟'' کہنے لگا ''شاید نہیں۔'' اس شام میں نے زندہ رہنے کے متعلق پہلی بار سنجیدگی سے سوچا تھا۔ پھر ایک دن تمھارا کزن معظم ملا۔ کہنے لگا۔ وہ پوچھ رہی تھی۔ میں نے اُس کی کار کے اردگرد تین چکر لگائے ''جی بھر کر دیکھ لو معظم۔'' وہ ہنس پڑا، میں نے بات مکمل کی۔ ''اُسے کہنا، میں اُس کی اُمیدوں کے برعکس ابھی تک زندہ ہوں'' اور میں وہاں سے چل دیا۔ خدا جانے تم تک یہ جواب پہنچا بھی۔

میں ماضی کے صحرا سے باہر نکلنے کی جدوجہد میں مصروف تھا کہ شاہدہ کے واپس لوٹنے کی خبر ملی۔ یہ جولائی کے وسط کی بات ہے۔ وہ اپنی چھوٹی بہن کو داخل کرانے آئی تھی۔ میں ہی جانتا ہوں، اس کے ساتھ تمھیں نہ پاکر میں نے کتنی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اُس سے گزرے دنوں کی باتیں ہوئیں۔ پھر اُس نے بتایا تمھاری منگنی خرم سے ہو چکی ہے۔ تمھاری بڑی بہن نے تھوڑی بہت مخالفت کی لیکن تم نے بڑی ہوشیاری سے سلسلہ سیدھا کرلیا۔ یوں اس اجنبی داستان کا خاتمہ ہوا جس کی ابتدا پورا ایک سال پہلے آج کے دن ہوئی تھی۔ مبارک ہو! تم نے اپنے وجود کے ٹکڑے جوڑ لیے۔ چلو تمھیں ایک ہونا تو نصیب ہوا۔

یاد ہے کبھی تم نے ایک لڑکی نبیلہ کا ذکر کیا تھا۔ ایک تنہا شام میں اداس بیٹھا تھا کہ اُس سے میری ملاقات ہوگئی۔ اس غریب نے میری بہت مدد کی۔ جب تک لاہور رہا پہروں میرے پاس بیٹھی تمھاری باتیں سنتی رہتی۔ ایک بار مجھے اپنے گھر بھی لے گئی۔ اُس کے ابو پروفیسر ہیں۔ یہ سبھی لوگ بہت اچھے تھے۔ ایک دن پوچھنے لگی ''آپ کو وہ بہت اچھی لگتی تھی۔'' میں نے کہا ''ہاں۔ اندازہ کرلو، اب یہ عالم ہے تو پہلے کیا ہوا ہوگا۔'' پھر میں نے اُس سے پوچھا ''تمھیں کنول کی باتیں بُری لگتی ہیں؟'' کہنے لگی ''نہیں بلکہ مجھے لگتا ہے، جیسے یہ نام میرے ہی وجود کا کوئی حصہ ہو۔'' مگر کاش تم نبیلہ ہوتیں اور تمھارے ڈیڈی ابو ہوتے!

پھر ایک شام دوستوں کو کچھ بتائے بغیر پنڈی لوٹ آیا۔ یہاں تمھارے ماموں کے بیٹے سے سرِ راہ ملاقات ہوگئی۔ اُس نے بتایا تمھارے ڈیڈی نے خرم کا خط پکڑا تھا، لیکن اس بات پر کوئی ایسا فساد نہیں ہوا۔ تم خرم سے ملنے پنڈی آتی رہیں (اُس کی تبدیلی یہاں ہوگئی ہے) تمھاری منگنی پر کوئی ہنگامہ نہیں ہوا، بلکہ انتہائی آسانی کے ساتھ تم ایک افسر سے پھسل کر دوسرے کی زندگی میں داخل ہوگئیں۔

یاد ہے کبھی تم نے کہا تھا ''میری شادی آپ سے ہوگی، ورنہ میں دنیا بھر کے سامنے آپ سے ملتی رہا کروں گی۔ خاوند نے روکا تو اُسے چھوڑ کر آپ کے پاس آجاؤں گی۔'' تم نے اپنے گفٹ پر یہ عبارت لکھ بھیجی تھی ''اُس کے لیے جسے میں عمر بھر نہ بھلا سکوں گی۔'' لیکن صرف پندرہ دن بعد تم سب کچھ بھول چکی تھیں۔ تم بڑے لوگوں کی بڑی باتیں!!! داد دینا پڑتی ہے۔ میں نے کتابوں میں پڑھا تھا کہ عورت اپنی پوری گہرائی سے پیار کرتی ہے۔ اُس کا پیار سمندر کی طرح پُرسکون اور کائنات کی مانند وسیع ہوتا ہے، جب کہ مرد کا پیار ناہموار، ریزہ ریزہ اور تند و تیز طوفان کی طرح اُبھرتا ڈوبتا رہتا ہے۔ اتنی غلط بات جانے کس نے لکھی۔ مجھے دیکھو میں مرد ہوں۔ جب تک تم ساتھ تھیں، میرے ذہن میں کوئی عورت انگڑائی نہ لے پائی۔ تم عورت ہو، لیکن تمھارے ذہن سے کار اور بنگلہ باہر نہ جا سکا۔ میں اپنی مفلسی کی قبا اُتار سکا نہ تم عرش سے زمین پر آپائیں۔ میں اپنے اندر کے انسان کو قتل کر سکا، نہ تم اسے زندہ قبول کرنے پر تیار ہوئیں۔ میں نے تمھیں زندگی سمجھا اور تم نے دولت کو۔ غلط قصے ہیں کہ محبت ہر دیوار کو گرا دیتی ہے۔ لوگوں کو بتاؤ کہ اس سماج میں محبت کے سوا ہر شے جائز ہے اور انسان کے سوا ہر چیز مہنگی۔ جب تک بڑائی زندہ ہے، انسان مرتا رہے گا۔ ورنہ اس ساری دنیا کی دولت میرے ایک سجدے کی قیمت سے بھی کم تھی...... لیکن تم نے مجھے میرے سجدوں سمیت کار تلے روند دیا۔

ہم بے بس لوگوں کی زندگی بہت کڑوی ہوتی ہے۔ دُکھوں کے زہر سے ہمیں موت نہیں آیا کرتی۔ تم نے مجھے زہر پلایا ہے نا، بھلا یہ بھی کوئی ایسی بات تھی کہ تم شرمندہ ہوتی پھرو؟ یہ تمھاری اپنی لاش ہے اسے پہچانو، یہ تم ہو، تمھارے اندر کا مرا ہوا انسان ہے، جس کی لاش سے تمھیں خوف آتا ہے۔ اِسی کی وجہ سے تم راتوں کو کانپ اُٹھتی ہو، لیکن گھبراؤ نہیں آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گی۔

پھر تمھارے ماحول میں تو پہلے ہی لاشوں کے انبار لگے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں؟ یہ لاشیں امی ہوتی ہیں، خالہ اور نہ ڈیڈی۔ صرف انسان کھاتی ہیں اور جب کچھ نہ ملے تو سانپ کی مانند اپنی اولاد کو بھی نگل جاتی ہیں۔ میں محسوس کر سکتا ہوں آج سے بیس تیس سال بعد تم بھی اِسی طرح اپنی اولاد کو کھا جاؤ گی۔ تم نے انہی تاریکیوں میں جنم لیا تھا اور انھیں پستیوں کی جانب واپس لوٹ گئی ہو۔ تاریکی کچھ اور بڑھی لاشوں میں ایک اور کا اضافہ ہوا! یہ لاشیں جلتے سراب ہیں۔ میں نے بہت چاہا کہ تم ان سے باہر آسکو۔ لاشوں کی بستی چھوڑ دو۔ لیکن تمھیں بچا نہ سکا۔ میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔ شرمندہ تو مجھے ہونا چاہیے!

چلو چھوڑو اس قصے کو تمھیں ایک نئی بات سناؤں۔ تین چار دن کی بات ہے، میں اپنے ایک دوست کو فون کرنے صدر والے پبلک آفس میں گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک تیز جسم والی برقعہ پوش خاتون اندر داخل ہوئی۔ اُس نے فون کا ڈائل گھمانے کے لیے ہاتھ باہر نکالا تو میں چونک اُٹھا۔ بالکل تمھارے والے ہاتھ تھے۔ اُس نے کئی بار نمبر ملایا اور پھر خاصی پریشان حالت میں ایک جانب بیٹھ گئی۔ لمحہ بھر کے لیے میں نے سوچا۔ یہ خاتون ایسے ہاتھوں سے چائے کا صرف ایک کپ بنا دے تو کتنا بڑا معجزہ ہو۔ اُس نے اپنے خوبصورت ہاتھوں سے آخری بار نمبر ملایا، لیکن پھر جیسے مایوس سی ہو کر باہر جانے کے لیے مڑی۔ اُس نے دو تین قدم لیے اور پھر کچھ سوچ کر رُک گئی۔ آخر وہ میری جانب آئی اور پوچھنے لگی ''آپ یونیورسٹی میں ہوتے ہیں نا!'' میں نے حیرت اور کہیں دُور اندر چھپی مسرت کے ملے جلے انداز میں جواب دیا ''جی ہاں۔'' کہنے لگی ''میں بہت پریشان ہوں ممکن ہو تو میری کچھ مدد کیجیے۔'' میں نے مختصراً جواب دیا ''فرمایئے؟'' وہ قریب والی کرسی پر بیٹھ گئی اور ہال میں بیٹھے سارے لوگ ہماری جانب متوجہ ہو گئے۔ اُس نے سرگوشی کی ''دیکھئے میں لاہور سے آئی ہوں۔ میری چھوٹی بہن نیو کیمپس میں پڑھتی ہے۔ میں نے آپ کو بہت دفعہ وہاں دیکھا ہے۔ آپ کا نام راجہ صاحب ہے نا؟''

اور پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر بولتے چلی گئی ''بات یہ ہے کہ میرے چھوٹے بھائی اور نوکر دونوں کو پولیس نے آوارہ گردی میں گرفتار کر لیا ہے۔ یہاں کا ایک پولیس انسپکٹر ہمارا واقف ہے۔ وہ فون پر نہیں ملا۔ آپ انھیں چھڑا دیجیے۔'' میں کوئی جواب دیئے بغیر اُٹھا اور متعلقہ تھانے

میں فون کیا۔ اتفاق سے تھانیدار واقف نکل آیا۔ میں نے کہا ''لگتا ہے جیسے دال، پیاز کی طرح مجرموں کی بھی کوئی قلت پیدا ہوگئی ہے۔ میری ایک کلاس فیلو کے بھائی لاہور سے سیر کے لیے آئے تھے آپ نے انھیں نوکر سمیت اندر کر دیا۔'' اُس نے نام پوچھا ''نام بتایئے، ابھی پتہ لگا لیتے ہیں۔'' میں نے فون پر ہاتھ رکھا اور پاس کھڑی خاتون سے کہا ''اُن کے نام۔'' وہ آہستہ سے بولی ''ایک کا منیر اور دوسرے کا مکھن۔'' میں نے فون پر یہی نام دہرا دیئے۔ تھانیدار زور سے ہنس پڑا ''راجہ صاحب کمال کرتے ہیں۔ کسی نے آپ سے مذاق کیا ہوگا۔'' میں نے ذرا سا حیران ہو کر کہا ''نہیں جی، ان کی باجی یہیں کھڑی ہیں۔'' تھانیدار نے پوچھا ''اُن کا نام فرزانہ تو نہیں۔'' میں نے اُلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ جواب دیا ''یہ تو مجھے معلوم نہیں۔'' تھانیدار نے کہا ''مجھ سے سنئے وہ لاہور کی ایک طوائف ہے۔ اُس کا نام فرزانہ ہے۔ یہ دونوں آدمی اُسی کے ہیں۔'' میں نے عورت کی جانب غور سے دیکھا جو میری موجودہ ذہنی کشمکش سے بے خبر اِس انتظار میں لگی تھی کہ میں اُسے کب خوشخبری سناتا ہوں۔ میں نے ذرا بھر توقف کیا اور پھر تھانیدار سے کہا ''دیکھئے آپ انھیں چھوڑ دیجئے تو مجھ پر احسان ہوگا۔ ورنہ پرچہ کاٹ دیجئے تاکہ ان کی ضمانت کا کوئی بندوبست ہو سکے۔ آپ نے گرفتاری کرنا ہے تو کسی اسمگلر کو پکڑیئے، کسی جاگیردار کو اندر کیجئے۔ کسی سرمایہ کار کی کھال کھینچئے۔'' میں نے گپ لگاتے ہوئے کہا ''ویسے میں آج کل تعلیم سے فارغ ہو چکا ہوں، اگر آپ چاہیں تو بے روزگاری کا یہ زمانہ اندر گزارنے کو تیار ہوں۔'' تھانیدار بہت معقول قسم کا آدمی تھا۔ اُس نے آدمی چھوڑ دینے کا وعدہ کیا۔ میں نے فون رکھا اور اُس سے کہا ''خاتون آپ جایئے۔ آپ کے آدمی آجائیں گے۔'' وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ ''نہیں آپ میرے ساتھ چلیں۔ چائے کا ایک کپ پی کر واپس آجایئے گا۔'' میں اب اُس کے احسان مند ہاتھوں سے چائے پینے کے لیے تیار نہ تھا۔ ''دیکھئے مجھے فون کا انتظار ہے۔'' اُس نے پورے اطمینان سے کہا ''میں اتنی دیر رُک جاؤں گی۔''

فون سے رہائی ملی تو میں نے دوبارہ اس سے معذرت چاہی۔ لیکن اُس نے ایک نہ سنی۔ ''نہیں آپ کو چلنا ہوگا۔'' ہم ٹیکسی پر بیٹھے اور ایک اوّل درجے کے ہوٹل میں پہنچے۔ میں اُس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ایک خوبصورت سے سجے سجائے کمرے میں داخل ہوا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے

مجھے تمھارے والے ہاتھوں سے چائے بنا کر دی۔ میں نے لمحہ بھر کے لیے خود کو ماضی کے سمندر میں ڈوبتا ہوا پایا، لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ اُس نے پندرہ منٹ کی خاموشی سے جیسے اُکتا کر کہا ''میں طوائف ہوں۔'' میں نے کہا ''ہاں جانتا ہوں۔'' پوچھنے لگی ''آپ نے تعلیم مکمل کر لی؟'' میں نے اُسی انداز میں جواب دیا ''جی بس یوں ہی سمجھ لیجیے۔'' خاصی سمجھ دار اور پڑھی لکھی عورت لگتی تھی۔ اُس نے دوبارہ خاموشی کو روندتے ہوئے کہا ''نیو کیمپس میں آپ کے ساتھ ایک سمارٹ سی لڑکی ہوا کرتی تھی۔'' میں نے کہا ''ہاں کبھی ہوا کرتی تھی اب صرف ماضی کی ایک یاد ہے۔ رشتہ تو اُس نے کسی اور سے جوڑ لیا۔'' پھر تمھارے متعلق بہت سی باتیں ہوئیں۔ میں نے موضوع بدلنے کے لیے اُس کی بہن کے متعلق پوچھا۔ کہنے لگی ''میری کوئی بہن نہیں۔ یونیورسٹی میں ایک لڑکا ہے۔ اعجاز نام ہے۔ میں اُسی کے ساتھ شام کے وقت کیمپس والی سڑک پر آیا کرتی تھی۔ وہ سڑک ذرا ویران سی ہے نا، ہم گاہکوں کے ساتھ اکثر اُسی طرف جایا کرتے ہیں۔ اعجاز نے آپ کا نام بتایا تھا۔ ہم کار پر ہوتے تھے، اس لیے آپ نے نہ پہچانا ہوگا۔'' تھوڑی دیر بعد وہ باتھ روم میں چلی گئی۔ میں نے تیسری پیالی کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے سوچا۔ وہ باہر آئے تو اجازت لوں۔ میں نے یونہی اخبار اُٹھایا اور وزیروں کی تصویریں دیکھنے لگا۔

وہ باہر آئی تو انڈرویر اور انگیا کے سوا اُس کے جسم پر کوئی غلاف نہ تھا۔ تمھیں یاد ہے نا میں ایسے مناظر پر بھڑکا نہیں کرتا، لیکن اس لمحے میں نے خود کو ذرا سا ہلتے پایا۔ ذہن نے قلانچ بھری لوگ بھی کتنے ظالم ہیں جو اتنے خوبصورت اور پُرکشش جسم کو نوچتے ہوں گے۔ اُس نے انڈرویر کرسی پر پھینکتے ہوئے کہا ''آ جایئے۔'' میں نے تین چار قدم لیے اور اُس کے قریب پہنچ گیا۔ ''نہیں میں بہت عجیب آدمی ہوں، میں انسان کا گوشت نہیں کھا سکتا۔ میں اجنبی ہوں۔ بالکل اور طرح کا انسان۔'' خاتون حیران سی ہوگئی ''آپ نے میری بہت مدد کی ہے میں اس کا معاوضہ دینا چاہتی ہوں۔'' میں نے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا ''میں آپ کے ہاتھ سے چائے کا صرف ایک کپ پینا چاہتا تھا۔ آپ نے تین پلا دیئے اس سے اچھا معاوضہ اور کیا ہوگا۔ میرے لیے آپ کا جسم بہت مقدس ہے۔ میں اسے ناپاک نہیں کر سکتا۔'' عورت اُٹھ کر بیٹھ گئی ''کتنی عجیب باتیں کرتے ہیں آپ۔ میں تو بہت گناہ گار ہوں۔ طوائف ہوں نا۔'' میں اُس کی سادگی پر مسکرا دیا۔

''اِس دنیا میں ایسی 'شریف عورتیں' بھی ہیں جو کار، افسری اور دولت کے لیے دوسروں کو ذبح کر دیتی ہیں۔ روپے تو سبھی عورتیں لیتی ہیں۔ اگر آپ صرف اسی وجہ سے طوائف ہیں تو پھر یہ سبھی مرد اور عورتیں آپ سے زیادہ گناہ گار ہیں اور آپ ان سب سے بہت اچھی ہیں۔ آپ نے یہاں آتے وقت پیار کا دعویٰ نہیں کیا۔ نہ مجھے چھوڑتے وقت آنسو بہائیں گی اور نہ بعد میں مجھے دھوکا دیں گی۔ آپ جو کچھ ہیں، سب کے لیے سب کے سامنے ہیں۔ مجھے آپ کا احترام ہے کہ آپ مجبور ہونے کے باوجود بہت پوتر ہیں۔ میں آپ سے صرف باتیں کر سکتا ہوں۔ ہم دونوں ایک ہی خاندان کے لوگ ہیں۔ آپ کا جسم لٹتا ہے اور میری محنت...... ہمیں تو ایک دوسرے کی مجبوریوں کا احساس ہونا چاہیے۔''

اُس نے بتایا اُسے یاد نہیں کہ کتنے لوگ اُس کے ساتھ سو چکے ہیں۔ اُس نے کسی سے پیار نہیں کیا نہ کسی نے اُس سے...... پھر میں نے اُس سے پوچھا ''آپ پر لوگ روپے کی پرستش کا الزام دیتے ہیں۔ فرض کیجیے کوئی مجھ سا غریب آدمی آپ کے قدم چومے، بہت زیادہ پیار کرے، آپ پر کوئی پابندی بھی نہ لگائے، آپ اُس کے ساتھ کیا سلوک کریں گی۔'' کہنے لگی ''اُسے کبھی نہیں چھوڑوں گی۔'' وہ سمٹ کر میرے اور قریب آ گئی۔ پھر اُس نے سادگی سے کہا ''آپ مجھے تم کہیں نا، پلیز۔'' میں نے بات جاری رکھی۔ ہاں تو پھر تم بتاؤ نا وہ عورت مجھے کیوں چھوڑ گئی۔''

تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ میں نے اُس کے ہاتھوں کو آخری بار سہلایا اور کہا ''اب اجازت دو، مجھے کہیں جانا ہے، شام ہونے والی ہے۔ تمھیں بھی اپنے دھندے پر نکلنا ہوگا۔ ہمیں اپنی مجبوریوں میں اور اضافہ نہیں کرنا چاہیے۔'' وہ اُٹھ کر میرے قدموں سے لپٹ گئی ''میں طوائف ہوں، میں پیار کے لفظ سے آشنا ہی نہیں۔ اِس قابل بھی نہیں کہ آپ سے پیار کر سکوں۔ میں آج کی رات کہیں نہ جاؤں گی، مجھے صرف ایک رات کا سکون چاہیے۔ میں اپنی خوشی سے آپ کو رکھنا چاہتی ہوں۔ دیکھیے پلیز۔'' میں نے آہستہ سے اُسے اُٹھایا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اُس کے مقدس ہونٹ چوم لیے اور پھر اُس کے سامنے جھک گیا۔

صبح جب بیدار ہوا تو فرزانہ انتہائی سکون سے میرے پہلو میں سو رہی تھی۔ میں نے اُس کے مرمریں جسم کو آخری بار چوما۔ کپڑے پہنتے ہوئے میری نظر اُس کے چہرے پر گئی تو اچانک مجھے

خیال آیا "زندگی بھی کیا حادثہ ہے۔ شاید ہم پھر کبھی نہ مل سکیں، بارش کے قطروں کی مانند، ایک سمندر میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے جُدا! قربتوں کے فاصلے کبھی طے نہیں ہو سکتے۔"
میں یہی کچھ سوچتے وہاں سے باہر نکل آیا۔

راستے میں مجھے احساس ہوا۔ میں خدا ہوں۔ میں نے تمھارا بُت بنایا تھا۔ تم ٹوٹ گئیں، مرا خدا ہونا مجھ سے نہیں چھنا۔ میں چاہوں تو کسی بھی پتھر کو تراش کر تم سا حسین بت بنا دوں۔ پھر اِس میں اپنی سوچوں کی رُوح پھونک دوں، یہی وہ راز تھا جو فرزانہ مجھے بتا گئی۔ ہاں تمھارے ٹوٹ جانے کا مجھے بہت دُکھ ہے۔ میں نے اپنی پوری دنیا تمھارے بت میں رکھ دی تھی۔ جہاں کہیں تمھاری صورت کا پرتو مل جائے، میرے درد تازہ ہو جاتے ہیں۔ میں اپنا تیشہ کندھے پر لٹکائے بیٹھا سوچ رہا ہوں کہ کوئی ایسی تخلیق کروں جو تمھارے ٹوٹ جانے کے درد سے آزاد کر دے۔ لیکن اب بُت بنانے سے پہلے مٹی ضرور جانچ لوں گا۔

جانتی ہو زندگی ایک ادھورا سفر ہے۔ تم مل بھی جاتیں تو کیا شب و روز کے طمانچے تھم جاتے۔ صرف چند سالوں بعد تمھارا حسن ضعف کے بادلوں میں ڈوب جاتا اور میری تمنائیں، میری خمیدہ کمر سے زیادہ جھک گئی ہوتیں۔ پھر کسی اداس شام ہم آسمان سے ٹوٹتے ستاروں کی طرح ایک ایک کر کے دنیا کی نظروں سے اُوجھل ہو جاتے۔ تم نے پل بھر کے اِس وقفے میں بنگلوں سے اپنی تکمیل چاہی اور میں نے تم سے۔ ہم دونوں ہی غلط تھے۔ مجھے تو احساس ہو گیا، تمھیں شاید کبھی ہو جائے۔

ہم تم تاریخ کے ایسے اُفق پر پیدا ہوئے جو اندھیروں اور اُجالوں کا سنگم ہے۔ پرانی قدروں کے اندھیرے اور نئی سوچوں کے اُجالے میں جنگ جاری ہے۔ ایک جانب مرنے والوں کا ماتم ہے اور دوسری جانب پیدا ہونے والوں کی خوشی میں شادیانے۔ ہر جانب ایک کہرام برپا ہے۔ آوازوں کے اِس شور میں کچھ سنائی نہیں دیتا۔ کوئی صورت پہچانی نہیں جاتی۔ تم اپنا دوپٹہ ہاتھوں میں اُٹھائے مرنے والوں پر شاید بین کر رہی تھیں، میں سمجھا تم نے نئی سوچوں کا پرچم تھام رکھا ہے۔ تاریخ کے ان گہرے دھندلکوں کے غبار میں تمھارے چہرے پر موجود کرب نزع بھی نہ دیکھ سکا۔ میں تمھیں اپنا ہم سفر جان بیٹھا اور آوازوں کے اس محشر کے درمیان کھڑا تمھیں بتاتا رہا۔ نئی دنیا کی

باتیں، جب اجالے ہوں گے، جب انسان اپنی انسانیت کے حوالے سے پہچانے جائیں گے۔ تم سر ہلاتی رہیں، جیسے سب کچھ سمجھ رہی ہو۔ ان ہی ہنگاموں میں تم مرنے والوں کے گروہ میں شامل ہو گئیں اور میری آنکھوں کے سامنے تم نے جان دے دی، مجھے ان سارے مرتے ہوئے لوگوں میں سے صرف تمھاری موت کا دُکھ ہے۔ میں تمھیں نہ بچا سکا۔ میں دھندلکوں کے دور کا انسان ہوں نا، ادھورا انسان...... مجھے معاف کر دینا۔

تم میری زندگی سے نکل گئیں اور میں نے بھی پرانی عقیدتیں ماضی کی قبر میں اُتار دی ہیں۔ تم عیسیٰ بن کے آؤ تو بھی کبھی انھیں زندہ نہ کر سکو گی۔ تم نے میری مفلسی کی پیٹھ پر لات ماری تھی۔ اب ساری کائنات گھسیٹ کر میرے قدموں میں رکھ دو تو بھی نہ پلٹوں گا۔ تم بے فکر رہو۔ میں ماضی کے حوالے سے تمھیں کبھی نہ ملنے آؤں گا...... کہ میں پیچھے سے آواز نہیں دیا کرتا۔ ہاں میں تم سے اب بھی نفرت نہیں کرتا۔ اس میں تمھارا کوئی کمال نہیں۔ یہ میری اپنی مجبوری ہے کہ میں اپنے ماضی سے متنفر نہیں ہونا چاہتا۔ میں تمھیں نہیں بھلا سکا...... لیکن میں تو اُس فقیر کو بھی نہیں بھلا سکا، جو بچپن میں ہمارے گھر کے سامنے صدا لگایا کرتا تھا۔ زندگی کو دیکھنے کا اپنا اپنا انداز ہے۔

محبت ایک پاکیزہ اور مقدس جذبہ ہے۔ میرا گناہ یہ نہیں کہ میں نے پیار کیا ہے۔ میرا جرم یہ ہے کہ میں نے پتھر کی مورت کو دیوی بنا دیا۔ سنگِ مرمر کے بُت کو انسان جانا۔ میں نے اُن آنکھوں میں وفا ڈھونڈنا چاہی، جو سونا اور چاندی دیکھنے کی عادی تھیں، جو شاید محبت کی پہچان ہی سے عاری تھیں۔ میں نے اُس سماج میں محبت کو ڈھونڈھنا چاہا، جہاں ڈھونڈے سے خدا بھی نہیں ملتا۔ میں جو دنیا کو بتایا کرتا تھا، خود بھول گیا کہ دھن والوں کی لغت میں محبت نام کا کوئی لفظ نہیں ہوتا۔ اُن کے نزدیک انسان سے محبت ایک بے معانی استعارہ ہے۔ وہ صرف اپنے آپ سے پیار کرتے ہیں۔ دولت کی زبان سمجھتے ہیں اور جب تک سماج پر دولت کا راج رہے گا محبت میں کامیابی بھی ناکامی ہے اور ناکامی بھی ناکامی!

میں تمھیں نہ تو ماضی کے وعدے یاد دلاؤں گا اور نہ وقتِ وداع کی قسمیں، تاکہ تم بھولی ہوئی داستان کو مکمل طور پر فراموش کر سکو۔ لیکن تمھیں اتنا ضرور بتانا چاہوں گا کہ تم نے ایک اور ٹھوکر کھائی ہے۔ زمانہ کروٹ لے چکا۔ تمھارے امیرانِ شہر کا سورج گہنا گیا ہے۔ اُن کی خاندانی

وجاہتیں آخری ہچکی لینے کو ہیں۔ اُن کی افسریاں دم واپسیں پر ہیں۔ اُن کی داغ دار عظمتیں آخری سانسوں پر ہیں۔ لیکن تم نے سدا کے اندھوں کی مانند، عالم نزع سے دوچار اِس طبقے کے ایک اندھے کا ہاتھ تھاما اور رات کے اندھیاروں میں کھو گئیں۔ تم اُس کشتی پر سوار ہو گئیں، وقت جس کا پیندا چھلنی کر چکا ہے۔

ہم آوارہ منتشر دیوانے لوگ، ہر کاج سے آج بے کار سہی، لیکن ہمارے دل کعبے کی مانند مقدس اور دولت کے لات منات سے پاک ہیں۔ تم اس کعبے میں داخل تو ہوئیں، لیکن تم نے دولت کے بت اپنی بغلوں سے نہ گرائے۔ انسان کی بجائے عہدے، اسٹیٹس اور رُتبے کی تمنا کبھی تمھارے دل سے نہ گئی...... لیکن یاد رکھو، روزِ محشر قریب ہے، جب آتش فشاں آگ اُگلیں گے۔ بھونچال اور زلزلے آئیں گے۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ ہوگا۔ کہیں امان نہ ملے گی۔ سماج کے بُت ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ آج جن کا مزاج عرشِ بریں پر ہے، وہ زمین پر پناہ ڈھونڈتے پھریں گے۔ جو آج ہمارے کندھوں پر سوار ہو کر چلتے ہیں، انھیں ہماری طرح اپنے پاؤں پر چلنا پڑے گا۔ ہمارے ساتھ زمین پر رہنا پڑے گا...... اور یہ تبدیلی تم اپنی زندگی ہی میں دیکھو گی۔

اور جب نئی زندگی، نئی دنیا کا سویرا طلوع ہوگا، تو انسان پہلی بار سکھ کا سانس لے پائے گا۔ انسان کو محبت کرنے کی آزادی ہوگی۔ پھر کوئی شخص میری مانند محبت کی بازی ہارے گا اور نہ کوئی امیر زادی تمھاری طرح دامن جھٹک کر راہ بدلے گی۔ پھر کسی کی محبت کا خرمن جلے گا اور نہ کسی کو میری مانند محرومیوں کا زہر پینا پڑے گا۔

تب تک کے لیے خدا حافظ!!

۱۷/ اپریل ۱۹۷۴ء

راولپنڈی

بیگم صاحبہ

آج تمھیں لاہور سے واپس لوٹے پورا ایک سال ہو گیا۔ آج ہی کے دن تم مجھ سے جُدا ہوئی تھیں، اور آج ہی کے دن تمھاری شادی ہے۔ کیسا عجیب اتفاق ہے۔

آج تمھاری شادی ہے۔ سوچتا رہا، سوچتا رہا، خوشی کے اِس موقع پر تمھیں کیا پیش کروں؟ میں تہیدست فلسفی، مجھ میں کوئی اچھا سا تحفہ خریدنے کی سکت کہاں؟ میری کل کائنات میرے اُچھوتے خیالات ہیں۔ میری ساری جائیداد میرا شعور اور میری دولت یہ چند الفاظ ہیں...... خوشی کے اس موقع پر میں اپنی ساری دولت اِس کتاب کی شکل میں تمھیں پیش کرتا ہوں۔

تم نے ایک بار خود کہا تھا، ان خطوط کو شائع کرا دینا چاہیے۔ تمھاری خواہش تھی کہ دنیا تمھیں میرے حوالے سے جانے۔ میں نے تمھاری یہ آخری خواہش بھی پوری کر دی۔ اب تمھیں لوگ میری وجہ سے جانیں گے۔ تمھیں اس کتاب کے ذکر سے پہچانیں گے اور پھر وہی فیصلہ کریں گے کہ زندہ رہنے کا حق مجھ غریب کا تھا، جس نے محبت کی، یا تم امیرزادی کا جس نے پیار کو ٹھکرا کر دولت اور افسری کو چُنا۔ لوگ فیصلہ کریں گے کہ ہم میں سے کون صحیح تھا اور غلط کون۔ ہم دونوں مر بھی جائیں گے تب بھی...... یہ مقدمہ لوگوں کی عدالت میں چلتا رہے گا۔ ہر دور کے انسان اس پر اپنا اپنا فیصلہ دیتے رہیں گے۔

مجھے یقین ہے یہ تحفہ تمھیں ہمیشہ عزیز رہے گا۔ تم فخر سے اپنی ہم جولیوں کو بتا سکو گی کہ تم پر کتاب لکھی ہے۔ آخر ہر حسین امیرزادی پر کتاب تو نہیں لکھی جاتی۔ اس لیے تمھارے طبقے کی ساری عورتیں عمر بھر تمھیں رشک سے دیکھا کریں گی۔ تم اس تحفے کے ذریعے اپنے خاوند کو بھی اپنی اہمیت کا احساس دلاتی رہو گی۔ تم اُسے بتا سکو گی کہ تم نے اس کے لیے کتنے لوگوں کو رد کیا ہے۔

خاوند اور محبوب میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تم بیوی بنی ہو، جلدی ہی یہ فرق تم پر واضح ہو جائے گا۔ لیکن اس تحفے کی بدولت خاوند عمر بھر تمھارا غلام رہے گا۔

......اور جب تم بوڑھی ہو جاؤ گی، جب یہ پرکشش آنکھیں بے نُور ڈھیلوں میں ڈھل جائیں گی۔ جب یہ سیاہ زلفیں مٹھی بھر سفید چٹیا میں بدل جائیں گی، جب اس حسین جسم پر اُجاڑ ویرانوں کا گمان ہوگا۔ خزاؤں کا راج ہوگا۔ جب تمھاری ٹھوڑی کا حسین تل ڈھلک کر سیاہ دھبے کی شکل اختیار کر لے گا اور جب تمھارے چہرے پر جھریوں کا جھرمٹ ہوگا......تب یہ کتاب تمھارا واحد سہارا ہوگی۔ تم اپنی نواسیوں سے پڑھوا پڑھوا کر یہ الفاظ سنا کرو گی۔ بیتے وقت کو یاد کرو گی اور شرمندہ بھی ہوگی۔ جس کی مجھے خواہش ہے نہ تم سے توقع۔ تمھاری نواسیاں بھی فخر سے لوگوں کو بتا سکیں گی کہ نانی اماں اپنے وقت کی کتنی عظیم خاتون تھیں! میں اُس وقت منوں مٹی تلے دبا ہوں گا، تمھاری دعاؤں اور بد دعاؤں سے بہت دور!

تمھیں یہ کتاب پڑھ کر خوشی ہوگی اور دنیا کی عبرت۔ یہ کتاب پڑھنے کے بعد کوئی غریب کسی امیر سے داستان محبت نہ چھیڑے گا۔ پھر کوئی مفلس تم امیروں کے سحر میں گرفتار نہ ہوگا۔ پھر کوئی جھونپڑوں کا مکیں، محلات سے رشتہ وفا نہ باندھے گا...... میری غلطی نہ دہرائے گا۔ کسی جال میں نہ آئے گا......اس طرح جانے کتنوں کا بھلا ہوگا۔

ہوسکتا ہے، قبریں پھٹ جائیں اور لاشیں اپنے کفن سمیت باہر آ جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے مجھے زہر پینے پر مجبور کر دیا جائے۔ میرے ہاتھ قلم کر دیئے جائیں یا میری زبان کھینچ لی جائے۔ کیونکہ میں نے سچ کہہ دیا ہے۔ ایک بڑے آدمی کی بیٹی مجھ چھوٹے انسان سے منسوب ہوگئی ہے اور لاشیں رُسوا ہوگئی ہیں۔ محلات کی قبروں میں بسنے والوں کو یہ کہہ دینا، مجھ غریب نے صدیوں سے اُن کی ناانصافیوں کا قرض اُٹھا رکھا تھا۔ یہ پہلی قسط ہے۔ شرمندہ ہوں کہ صرف اتنی ادائیگی ہی کر پایا، باقی حساب ہماری نسلیں آپس میں طے کر لیں گی......!

جھوٹے روپ کے درشن

''میرا یقین ہے کہ جو لوگ انسانوں کے جبلی اور بنیادی جذبات کی قدر کرنا نہیں جانتے وہ ادھورے لوگ ہوتے ہیں چاہے وہ بہت بڑے مصلح ہوں، چاہے بہت بڑے انقلابی۔ راجہ انور کی تازہ تصنیف پڑھ کر مجھے اس لیے خوشی ہوئی ہے۔ نہ جانے مستقبل کے لیے اس نوجوان کے کیا ارادے ہیں، لیکن اگر اس نے سیاسی لیڈر بننا پسند کیا تو یہ ایک ایسا لیڈر ہو گا جسے دیکھ کر نہ ہنسی آئے گی نہ اس سے ڈر لگے گا۔ بلکہ اس پر پیار آئے گا کیوں کہ اس نے پیار کی تمام پرتوں اور مرحلوں کو اپنے خون میں کھپا کر اپنی شخصیت کا ناگزیر حصہ بنا لیا ہے۔''

احمد ندیم قاسمی

13 مارچ 1974ء

Buy online:
www.jworldtimes.com
www.jbdpress.com

ISBN: 978-969-573-334-9